زندگی، بے بندگی، شرمندگی

حقوق العباد

بنت الاسلام

زندگی بے بندگی شرمندگی

حقوق العباد

بنت الاسلام

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی ۲۵

مطبوعات ہیومن ویلفیر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) نمبر ۲۹۱

نام کتاب	:	حقوق العباد
مصنف	:	بنت الاسلام
صفحات	:	۱۸۰
اشاعت دوم	:	جون ۲۰۰۲ء
تعداد	:	۱,۰۰۰
قیمت	:	-/۴۰
ناشر	:	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ـ ۱۱۰۰۲۵

فون: ۶۹۱۱۶۵۲، ۶۹۱۴۳۴۱ فیکس: ۶۳۱۷۸۵۸، ۶۸۲۰۹۷۵

E-mail: mmipub@nda.vsnl.net.in
Website: www. mmipublishers.net

مطبوعہ	:	اصیلہ آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی ـ ۲

HUQUQUL IBAAD (Urdu)
By: Bintul Islam
Pages: 180
Price: Rs.40.00

ترتیب

تعارف	۵
حقوق العباد کی اہمیت	۹
ازدواجی زندگی کی فضیلت اور افادیت	۱۳
شوہر کے حقوق	۲۴
بیوی کے حقوق	۳۸
والدین کے حقوق	۴۸
اولاد کے حقوق	۶۳
رشتہ داروں کے حقوق	۸۶
ہمسایوں کے حقوق	۹۶
غلام اور خادم کے حقوق	۱۰۶
یتیم اور بیوہ کے حقوق	۱۱۹
محتاج، مسکین، مفلس، مجبور اور مصیبت زدہ کے حقوق	۱۳۴
حکمران اور رعایا کے باہمی حقوق	۱۴۱
عورت کے حقوق	۱۵۰
اسلامی برادری کے حقوق	۱۶۱

متفرق حقوق	۱۷۲
مہمان اور میزبان کے حقوق	۱۷۲
بیمار کے حقوق	۱۷۵
قرضدار اور قرض خواہ کے حقوق	۱۷۵
مزدور کے حقوق	۱۷۸
ذمّی کے حقوق	۱۷۸
انسانی برادری کے حقوق	۱۷۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تعارُف

سلسلۂ "زندگی بے بندگی شرمندگی" کا یہ حصّہ "حقوق العباد" سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے پہلے اس سلسلے کی "نفس کا تزکیہ" شائع ہو چکی ہے۔ مندرجہ ذیل شائع ہونے والی ہیں:

- آخرت
- حب الٰہی
- داعی کے اوصاف
- صلوٰۃ و زکوٰۃ
- صیامِ رمضان و حجِ بیت اللہ

رب العالمین کے اس کرم و احسان کا شکر کس طرح ادا کیا جائے کہ یہ سلسلہ ساتویں حصّے تک پہنچ گیا ہے۔ تصنیف و تالیف سے تعلق رکھنے والے لوگ خوب جانتے ہیں کہ اس کام کی راہ میں گوناگوں دقتیں پیش آتی ہیں اور پھر کتابوں کی طباعت کے مراحل میں سے گزر کر عوام کے ہاتھوں میں پہنچنا بذاتِ خود ایک مہم سے کم نہیں ہوتا، مگر جس رؤف و رحیم مالک کے بھروسے پر یہ کام شروع کیا گیا تھا، وہ ہر ہر مرحلے میں اس طرح غیب سے رہنمائی اور امداد بہم پہنچاتا رہا کہ اگرچہ اس کے "مسبّب الاسباب" ہونے پر تو ہمیشہ ہی سے یقین تھا مگر اب تو یہ حقیقت دل و دماغ میں اس طرح نقش ہو گئی ہے کہ کوئی مشکل سے مشکل کام بھی محال نہیں لگتا۔

جب یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا تو زندگی میں فرصت اور اسباب و وسائل دونوں کی کمی تھی مگر چونکہ اللہ پاک کو اس کام کا ہونا منظور تھا، اس لئے وہ اپنی رحمت و شفقت سے کام لیتے ہوئے وقت بھی بہم پہنچاتا رہا اور اسباب و وسائل بھی مہیا فرماتا رہا!

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ۔

(النمل: ۱۹)

(اے میرے رب! مجھے اس پر مداومت دیجئے کہ میں آپ کی ان نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھے عطا فرمائی ہیں)

پہلی چھ کتابوں کے موضوعات کی طرح اس ساتویں حصّے کا موضوع بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک مسلمان کی زندگی میں حقوقِ الٰہی کے علاوہ حقوق العباد کو بھی جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد ایک مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتا ہے جس کے اردگرد انسانی تعلقات کے دائرے کھنچے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا اور قریب ترین دائرہ تو اس کا اپنا گھر ہے جہاں وہ اُن متعلقین کے ساتھ رہتا ہے جن سے اس کا سب سے زیادہ قریبی تعلق ہے۔ اب ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان سب اہلِ خانہ کے حقوق کو پہچاننے اور انھیں ادا کرنے کے لئے کوشاں رہے۔

گھر کے دائرے کے آگے پھر دوسرا دائرہ اُس معاشرے کا ہے جس میں انسان نے اُٹھنا بیٹھنا اور ملنا جلنا ہوتا ہے اور جو اس کی زندگی کی ضروریات کے پورا ہونے میں اس کا مددگار بنتا ہے۔ یہاں اس کے کچھ رشتے دار ہوں گے، کچھ ہمسائے ہوں گے، کچھ دوست احباب ہوں گے، کچھ رفقائے کار ہوں گے، بہت سے ایسے ہوں گے جن سے اس کا براہِ راست تعلق ہوگا اور بے شمار ایسے بھی ہوں گے جن سے اس کا براہِ راست تو کوئی تعلق نہیں ہوگا مگر بالواسطہ ضرور ہوگا۔ اب جو انسان ایک سچّا مسلمان بن کر جینا چاہتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان سب کے حقوق سے واقفیت حاصل کرے اور انہیں ادا کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

اس دائرے کے آگے پھر اُس ریاست کا دائرہ ہے جس کا وہ ایک باشندہ ہے۔

اس ریاست میں یا تو وہ حکمران ہے یا اُس کا رعایا سے تعلق ہے۔ اب اگر وہ حکمران ہے تو ضروری ہے کہ اُسے معلوم ہو کہ رعایا کے اُس پر کیا کیا حقوق ہیں جو اُس نے لازماً ادا کرنے ہیں اور اگر وہ رعایا میں سے ایک فرد ہے تو اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ جائز امور میں حکمرانوں کی اطاعت کرنے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے کے سلسلے میں اس پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں!

ریاست کے دائرے کے آگے ایک اور بہت بڑا دائرہ ہے جو قطبین تک پھیلا ہوا ہے اور یہ اخوتِ اسلامی کا دائرہ ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی مسلمان موجود ہے وہ اُس کا بھائی ہے۔ اس سے محبت کرنا، اس کی خیرخواہی چاہنا، اس کی خوشی سے خوش اور اُس کے دُکھ پر دُکھی ہو جانا اُس کے مومن ہونے کی علامت ہے۔ لہٰذا اُس کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلامی اخوت کی رُو سے اس پر دوسرے مسلمانوں کے کیا کیا حقوق عائد ہوتے ہیں جن کا ادا کیا جانا از بس ضروری ہے۔

اب جو انسان سچے دل سے ایک مسلمان بن کر رہنے کا خواہشمند ہوگا، اُس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ خدا کے حقوق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کے گرد کھنچے ہوئے ان انسانی تعلقات کے دائروں کے حقوق بھی پہچانے اور امکان کی حد تک اُن کی ادائیگی کے لئے کوشاں رہے۔

زیرِ نظر کتاب میں قرآنِ پاک، احادیث نبویؐ اور سلف صالحین کے اقوال و افعال کی روشنی میں انہیں حقوق کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ایک مسلمان نے اپنے کنبے، اپنے معاشرے، اپنی ریاست اور عالم اسلام کے سلسلے میں ادا کرنے ہوتے ہیں اور جنہیں ادا کئے بغیر وہ ایک سچا مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اس کتاب میں زیادہ تر حقوق ہی کی بات کی گئی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ فرائض کو نظر انداز کیا گیا ہے بلکہ ایک طبقے کے حقوق بیان کرنے کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ دوسرے طبقے کے فرائض بیان کئے جا رہے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ بچے کا یہ حق ہے کہ اُسے پالا جائے اور عمدہ تربیت دی جائے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ والدین کا فرض ہے کہ وہ بچے کو پالیں اور اُسے

عمدہ تربیت دیں۔ ایسے ہی جب بیوی کا مہر اور نان ونفقہ لینے کا حق تسلیم کیا جاتا ہے تو دوسرے الفاظ میں یہی کہا جاتا ہے کہ خاوند کا فرض ہے کہ بیوی کو مہر اور نان ونفقہ دے۔ اسی طرح مزدور کا یہ حق بیان کرنا کہ اُسے اُس کی اُجرت جلد اور پوری پوری ملنی چاہیئے، درحقیقت یہ کہنا ہے کہ جس نے مزدور سے کام کروایا ہے اُس کا فرض ہے کہ اُس کی مزدوری جلد اور پوری پوری ادا کرے۔ لہٰذا اس کتاب کا موضوع تو یہی ہے کہ مختلف طبقات کے حقوق بیان کئے جائیں مگر فرائض بھی ساتھ ہی ساتھ بیان ہوتے جارہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ وہ اس سلسلے کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور جس مقصد کے لئے یہ لکھا جارہا ہے، اپنی رحمت کاملہ سے کام لیتے ہوئے اس مقصد کو پورا فرمائے۔ آمین ــــــ!

بنت الاسلام

۲۸ رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حقوق العباد کی اہمیت

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! ہمارے ہاں تو مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس نہ روپیہ پیسہ ہو نہ ساز و سامان۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز اور روزے اور زکوٰۃ لے کر آئے گا مگر اس حالت میں آئیگا کہ کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا اور کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا۔ پھر وہ بیٹھے گا اور اس کی کچھ نیکیاں، اس کے مظالم کے قصاص کے طور پر ایک (مظلوم) لے لے گا اور کچھ دوسرا (مظلوم) لے لے گا۔ پھر اگر اس کی نیکیاں اس کی خطاؤں کا قصاص ادا کرنے سے پہلے ہی ختم ہوگئیں تو پھر اس کے مظلوموں کی خطائیں لے لی جائیں گی اور اس (ظالم) پر ڈال دی جائیں گی۔ پھر اُسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

(ترمذی)

یہ کون بدنصیب ہوگا جس نے نمازیں بھی پڑھی ہوں گی، روزے بھی رکھے ہوں گے، زکوٰۃ بھی ادا کی ہوگی، یعنی اللہ تعالیٰ کے یہ تینوں اہم حقوق پورے کیے ہوں گے مگر اس کے باوجود دوزخ میں ڈال دیا جائے گا!!

خدا کے حقوق ادا کرتے رہنے کے باوجود وہ دوزخ میں کیوں ڈال دیا جائے گا ــــ؟

اُس لئے کہ اس نے خدا کے حقوق تو ادا کیے ہوں گے مگر خدا کے بندوں کے حقوق نہیں ادا کیے ہوں گے۔ اُس کے انسانی بھائیوں کا اُس پر یہ حق تھا کہ وہ بے وجہ انہیں ظلم و ستم

کا نشانہ نہ بناتا، مگر اس نے
کسی کو گالی دی،
کسی پر تہمت لگائی،
کسی کا مال کھایا،
کسی کا خون بہایا،
اور کسی کو مارا،

لہٰذا اس نے خدا کے جو حقوق ادا کیے تھے وہ اُسے خدا کی مخلوق پر ظلم کرنے کی سزا سے نہیں بچا سکیں گے، کیونکہ خدا کو اپنی مخلوق بے انتہا عزیز ہے۔

حضرت عمرؓ بن خطاب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ قیدی آئے۔ قیدیوں میں سے ایک عورت کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ اچانک قیدیوں میں اسے ایک بچہ مل گیا۔ اُس نے فوراً اس بچّے کو پیٹ سے چمٹا لیا اور اُسے دُودھ پلانے لگی۔ (اس پر) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ کیا تمہارے خیال میں یہ عورت اپنے بچّے کو آگ میں پھینک دے گی۔ ہم نے عرض کیا کہ نہیں، خدا کی قسم، جہاں تک اس کا بس چلے گا وہ اسے آگ میں نہیں پھینکے گی۔ (یہ سن کر) حضورؐ نے فرمایا کہ جتنی یہ عورت اپنے بچّے پر مہربان ہے خدا اس سے زیادہ اپنے بندوں پر رحم فرمانے والا ہے۔ (مسلم)

ایسا شفیق خالق یہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ انسان اس کے حقوق تو ادا کریں مگر اس کے بندوں کو لاپروائی، ظلم و ستم اور بے انصافی کا نشانہ بنائے رکھیں، چنانچہ جو نماز پڑھنے والا، روزے رکھنے والا، زکوٰۃ ادا کرنے والا خدا کے بندوں کو مظالم کا نشانہ بناتا رہا ہوگا اُسے اسی قابل سمجھا جائے گا کہ اس کی نیکیاں اُس کے ظلم و ستم کے فدیے کے طور پر اُس کے مظلوموں میں بانٹ دی جائیں اور اگر اس کی نیکیاں کم اور اس کے ظلم زیادہ ہوں تو پھر اُس کے مظلوموں کے کیے ہوئے گناہ اُن سے لے کر اس ظالم کے سر پر ڈال دیے جائیں اور اُسے آگ میں جھونک دیا جائے!

حضورؐ کی یہ حدیث حقوق العباد کی اہمیت کو نہایت خوبصورتی سے واضح کیے دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان جو دنیا میں خدا کا نائب بن کر آیا تھا، اپنا فریضۂ نیابت اس وقت تک کما حقہٗ ادا نہیں کر سکتا، جب تک وہ انسانوں کے ساتھ تعلق قائم نہ رکھے اور انسانوں کے باہمی تعلقات کا عمدگی سے قائم رہنا منحصر ہے اس بات پر کہ انسان ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں۔

حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں ایک ضروری بات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ ایک انسان کو حقوق تو بہت سے لوگوں کے ادا کرنے ہوتے ہیں، مگر کسی انسان کے لیئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ان سب حقوق کو یکساں طور پر سرانجام دے سکے۔ اس لیئے اسلام نے حقوق کے معاملے میں ترتیب کو واضح کر دیا ہے اور ترتیب کا اصول یہ ہے کہ جو شخص آپ سے زیادہ قریبی تعلق رکھتا ہے وہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ آپ پہلے اس کا حق ادا کریں۔ مثلاً: ایک شخص کی ماں بھی بیمار ہے اور ہمسایہ بھی اور ہم وطن بھی۔ اب اس انسان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی ماں کی تیمارداری کرے کیونکہ ماں کا اُس سے جو تعلق ہے وہ ہمسائے اور ہموطن کے تعلق سے زیادہ قریبی ہے۔ ماں کی تیمارداری کر کے اگر وہ ایک اور شخص کی تیمارداری بھی کر سکتا ہے تو پھر ہمسائے کو ہموطن پر ترجیح دے کیونکہ ہمسائے سے اس کا تعلق ایک عام ہم وطن کے تعلق سے زیادہ قریبی ہے۔ ہاں اگر وہ تینوں کی تیمارداری کر سکتا ہے تو پھر ضرور تینوں ہی کی کرے، ورنہ جس کا تعلق زیادہ قریبی ہو اس کو ترجیح دے۔ اب اگر کسی شخص نے اپنی بیمار ماں کو نظر انداز کر کے جا کر ہمسائے کی تیمارداری شروع کر دی تو اس نے کوئی نیکی کا کام نہیں کیا۔ کیونکہ اس پر اوّلین حق اس کی ماں کا تھا ہمسائے کا نہیں تھا۔ ماں کی تیمارداری کر کے پھر ہمسائے کی بھی کرنا تو بہت ثواب کا باعث ہے مگر زیادہ حق رکھنے والے کو چھوڑ کر کم حق رکھنے والے کی طرف متوجہ رہنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی انسان پانچ فرض نمازیں تو ادا کرے نہیں اور بکمال ذوق و شوق سے تہجد پڑھنا شروع کر دے۔ ظاہر ہے کہ اسے کوئی شخص بھی "نمازی" نہیں کہے گا۔

اللہ تعالیٰ کے اس حکیمانہ اصول نے کہ جو زیادہ قریبی تعلق رکھتا ہے وہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کے حقوق پہلے ادا کیئے جائیں، انسانی حقوق کی ادائیگی میں بڑی سہولت پیدا کر دی

ہے۔ کیونکہ ہر انسان جب اپنے قریبی ماحول کے حقوق کی نگہداشت کرنے میں کوشاں رہے گا، تو پھر پورے معاشرے میں ہر جگہ خود بخود ہی حقوق کی ادائیگی ہوتی رہے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی واضح ہے کہ قریبی تعلق رکھنے والوں کے حقوق ادا کرنا زیادہ آسانی اور سہولت کی بات ہے، بہ نسبت اس کے کہ دُور کا تعلق رکھنے والوں کے حقوق ادا کیے جائیں۔ لہٰذا نسبتاً آسان کام پہلے کیا جائے اور پھر ممکن ہو تو مشکل کام بھی کیا جائے۔ آئندہ صفحات میں بھی مختلف گروہوں اور طبقات کے حقوق بیان کرتے ہوئے بھی اسی اصول کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ پہلے ان حقوق کو بیان کیا گیا ہے جو ایک کنبے کے مختلف افراد کو ایک دوسرے کے سلسلے میں حاصل ہوتے ہیں، پھر معاشرے کے مختلف طبقات کے باہمی حقوق بیان کیے گئے ہیں اور آخر میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ کسی انسان کا محض مسلمان ہونا ہی اسے اس بات کا حقدار بنا دیتا ہے کہ دوسرے مسلمان اس کے وہ حقوق ادا کریں جو شریعت نے اُسے عطا کیے ہیں۔

ایک کنبے میں رہنے والے مختلف افراد کے باہمی حقوق بیان کرنے سے پہلے یہ مفید معلوم ہوتا ہے کہ نکاح اور ازدواجی زندگی کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نگاہ واضح کر دیا جائے کیونکہ کنبے کی بنیاد نکاح پر قائم ہوتی ہے۔

ازدواجی زندگی کی فضیلت اور افادیت

سورۃ النور آیت ۳۲ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَ اَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ۔ "تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اُن کے نکاح کردو۔"

تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۳۹۷ پر اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے بیان ہوا ہے:

"اصل میں لفظ اَیَامٰی استعمال ہوا ہے جسے عام طور پر لوگ محض بیوہ عورتوں کے معنی میں لے لیتے ہیں، حالانکہ دراصل اس کا اطلاق ایسے تمام مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جو بے زوج ہوں۔ اَیَامٰی جمع ہے اَیِّم کی اور اَیِّمٌ ہر اُس مرد کو کہتے ہیں جس کی کوئی بیوی نہ ہو اور ہر اس عورت کو کہتے ہیں جس کا کوئی شوہر نہ ہو۔"

اس آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کے لئے یہی پسند فرمایا ہے کہ وہ نکاح کرکے ازدواجی زندگی گزاریں اور خواہ مخواہ تجرد کی حالت میں نہ رہیں۔ دنیا میں کئی ایسے مذاہب اور طریقہ ہائے زندگی رہے ہیں اور اب بھی ہیں، جنھوں نے شادی نہ کرنے کو نیکی کی بات سمجھا ہے مگر اس کے برعکس اسلام نے تجرد کی زندگی کو پسند نہیں کیا اور شادی کرنے کو نیکی کی بات قرار دیا ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح میری سنّت ہے۔ پس جو کوئی میری سنت پر نہ چلے وہ مجھ سے تعلق نہیں رکھتا۔۔۔۔ (ابن ماجہ)

نکاح کی افادیت اسی سے ظاہر ہے کہ معاشرے کے ہر گھر کی بنیاد نکاح پر ہوتی ہے اور "گھر" معاشرے کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح قطرہ اور قطرہ مل کر بارش بن جاتے ہیں اسی طرح گھر اور گھر مل کر معاشرہ وجود میں آجاتا ہے۔ لہٰذا جو صفات انفرادی طور پر ان گھروں میں پائی جائیں گی وہی اس معاشرے کی نمایاں خصوصیات ہونگی جو ان کے گھروں کی بنیاد پر قائم ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اصلی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ان کے بارے میں تاکیدی احکام دیئے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ گھر کے اندر نظم وضبط، امن وسکون، باہمی شفقت ومحبت اور دین وایمان کی روح کارفرما رہے تاکہ ان گھروں کے ملنے سے جو معاشرہ وجود میں آئے وہ بھی ان صفات کا حامل ہو۔

ازدواجی زندگی اختیار کرنے پر اسلام نے جو زور دیا ہے اس کے پیش نظر یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ گھر کے اندر رہنے والے مختلف افراد کے باہمی حقوق بیان کرنے سے پہلے یہ واضح کردیا جائے کہ ازدواجی زندگی کے وہ دینی اور دنیوی فوائد کیا ہیں جن کے باعث نکاح کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

۱۔ عفت وعصمت کی حفاظت

ہم انسان کی آفرینش کا حال پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ عورت کو خدا تعالےٰ نے مرد ہی سے پیدا کیا تھا۔ لہٰذا ان دونوں جنسوں کا ایک دوسرے سے بالکل کٹی ہوئی زندگی گزارنا تقریباً ناممکن ہے اس لئے اگر یہ جائز طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہ رہیں گے تو پھر ناجائز طریقے اختیار کرنے پر تُل جائیں گے۔ دنیا کا کوئی نظام بھی ان دونوں کو ایک دوسرے سے کلّی طور پر علٰحدہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس لئے جن مذاہب اور طریقہ ہائے زندگی میں رہبانیت پر زور دیا گیا وہاں انسان کی پاکدامنی کو زیادہ ہی نقصان پہنچا۔ راہب خانوں کی اندرونی زندگی سخت گھناؤنی رہی ہے اور انسان نے جب بھی اور جہاں بھی قدرت کے خلاف جنگ کی، شکست ہمیشہ انسان ہی کے حصے میں آئی۔

اسلام نے اپنے پیروؤں کو اس آزمائش میں پڑنے ہی نہیں دیا اور رہبانیت اور

ترکِ دنیا کو ناپسندیدہ ٹھہرا کر نکاح کر کے پاکدامنی کی زندگی گزارنے کو بہت بڑی نیکی قرار دے دیا ہے تاکہ انسان اس صورتِ حالات میں گھرنے نہ پائے جو اس کے چال چلن اور عفت وعصمت کے لئے خطرناک ہے۔

قرآن میں نکاح کے لئے لفظ "اِحْصَان" استعمال ہوا ہے۔ احصان کے معنی حفاظت کرنے اور حفاظت گاہ بنانے کے ہیں۔ شادی شدہ عورت کے لفظ "مُحْصَنَۃ" استعمال کیا گیا ہے یعنی وہ عورت جو قلعے کے اندر محفوظ ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس عورت کی شادی ہوگئی وہ خود اور اس کی عفت وعصمت وغیرہ سب کچھ ایک پناہ گاہ میں محفوظ ہوگیا۔ مسلم میں ایک حدیث بیان ہوئی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو شخص نکاح کرنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ نکاح کرلے، کیونکہ نکاح آنکھ کو بہت زیادہ نیچی رکھنے والا اور بدکاری سے بہت زیادہ محفوظ کرنے والا ہے۔۔۔۔" (مسلم)

ایسے ہی ایک اور حدیث ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین آدمی ایسے ہیں جن کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ پر لازم ہے (ایک وہ مجاہد) جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے (دوسرے وہ) مکاتَب (غلام) جو بدلِ کتابت ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور (تیسرے وہ) نکاح کرنے والا جو پاکدامنی کا ارادہ رکھتا ہے۔ (ترمذی)

۲۔ نسلِ انسانی کی بقاء حفاظت اور تعلیم و تربیت

نکاح کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ نسلِ انسانی باقی رہے۔ ہر انسان نے اپنی طبعی عمر پوری کر کے دنیا سے چلے جانا ہوتا ہے۔ اس لئے دنیا میں انسانیت کے باقی رہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جانے والے اپنی جگہ دوسرے انسان چھوڑ جائیں تاکہ انسانیت کا سلسلہ چلتا رہے۔ اس پر بعض کوتاہ نظر لوگ یہ کہتے ہیں کہ نسلِ انسانی تو شادی کی جکڑ بندیوں کے بغیر بھی چل سکتی ہے، صرف اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے نکاح کو ضروری قرار کیوں دیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مقصد صرف آئندہ نسلوں کو دنیا میں لے آنا ہی نہیں بلکہ انکی حفاظت

اور تعلیم و تربیت بھی ہے اور اُن کی حفاظت اور تعلیم و تربیت کے لئے ضروری ہے کہ اُنھیں ایک محفوظ گھر دیا جائے جہاں ایسے ہمدرد، بہی خواہ اور جاں نثار لوگ موجود ہوں جو نہ صرف احساسِ فرض ہی کے باعث بلکہ دل کے جذبے اور قلبی محبت کے باعث بھی ان کی غور رد پرداخت کریں۔

انسان کا بچہ دوسری مخلوقات کے بچوں کی نسبت بہت زیادہ بے چارہ اور عاجز ہوتا ہے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں بہت لمبا وقت لیتا ہے۔ ایک چوزے کو دیکھیں کہ کس طرح انڈے سے نکلتے ہی چلنے پھرنے اور دانہ چگنے لگتا ہے مگر انسانی بچے کی نشو ونما اتنی سست ہوتی ہے کہ اُسے پالنے کے لئے سالہا سال تک مسلسل محنت اور جانفشانی سے کام لینا پڑتا ہے اور یہ محنت اور جانفشانی ماں کی مامتا اور شفقت پدری ہی کر سکتی ہے۔ انسانی معاشرے میں اور کوئی ادارہ ایسا نہیں جس کے رہنے والوں میں باہم اتنی محبت اور لگاؤ ہو جتنا اس ادارے کے رہنے والوں کے درمیان قدرتی طور پر بغیر کسی تکلف سے کام لیے، پیدا ہو جاتا ہے۔ صرف یہی ایک ادارہ ہے جہاں سکھانے والے دلی خواہش رکھتے ہیں کہ سیکھنے والے اُن سے آگے بڑھ جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو نظام زندگی گھریلو زندگی کو تباہ کرے گا وہ انسانیت کے سکون و عافیت کا دشمن ہوگا۔ جو نسلیں گھریلو ماحول میں والدین کی شفقت کے زیرِ سایہ پلنے کے بجائے دوسرے اداروں کے مشینی ماحول میں پلیں گی، ان میں وہ اعلیٰ انسانی صفات پیدا نہ ہو سکیں گے جو انسانیت کی معراج ہیں۔ نہ اُن میں فیاضی اور ایثار ہوگا، نہ باہمی تعاون و ہمدردی، نہ آپس میں مل بانٹ کر کھانے کی صلاحیت، نہ ایک دوسرے کی خاطر تکلیفیں سہنے اور قربانی دینے کا جذبہ اور نہ بے غرضانہ طور پر دوسروں کے لئے سب کچھ نچھاور کر دینے کا ذوق۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اسلام نے چار وجوہ کے باعث اولاد کی پیدائش اور پرورش کی ترغیب دی ہے۔

۱۔ اللہ کی مخلوق باقی رہے۔

۲۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اپنی امت کی کثرت کے باعث دوسری

امتوں پر فخر کروں گا۔
۳۔ اولاد صدقۂ جاریہ ہے۔
۴۔ بچپن میں مرجائے تو والدین کی شفاعت کرے گی۔

۳۔ مرد وزن کی صلاحیتوں کا نشوونما پانا

ازدواجی زندگی کا تیسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ یہ نظام مردوں اور عورتوں کی صلاحیتوں کو نشوونما دیتا ہے۔ اہلی زندگی چونکہ ذمہ داریوں کی زندگی ہوتی ہے اس لئے ذمہ داریوں کا احساس بہت سی ایسی سوئی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو جگا دیتا ہے کہ اگر ان ذمہ داریوں کا بوجھ نہ پڑتا تو وہ سوئی ہی رہتیں۔ ان ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے، معاشرتی حقوق ادا کرنے اور اس سلسلے میں پہنچنے والی تکلیفوں کو برداشت کرنے سے نفس کی تربیت ہوتی ہے اور روحانی اور اخلاقی قوتوں کی راہ کھلتی ہے۔

پھر ازدواجی زندگی اخراجات بھی بڑھاتی ہے اور جب ان بڑھے ہوئے اخراجات کا بوجھ پڑتا ہے تو ایک طرف مرد مزید کمانے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری طرف عورتیں آمدنی اور اخراجات میں توازن پیدا کرنے کی کوشش میں سلیقہ اور سگھڑاپہ سیکھ لیتی ہیں۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ ایسے نوجوان جن کے چال چلن اچھے نہ تھے یا جو آوارہ گردی کے عادی تھے، شادی کے بعد بالکل درست ہوگئے۔ شادی کوئی جادو منتر نہیں تھا کہ پھونک مارنے سے وہ درست ہوگئے بلکہ حقیقت یہی ہے کہ ذمہ داریوں کے احساس نے انھیں درست کردیا۔

پھر یہ بھی ہے کہ اولاد ہمیشہ والدین کی مرضی کے مطابق ہی پروان نہیں چڑھتی، بچپن میں ان کی شوخیاں اور شرارتیں جو بعض اوقات بیہودگی کی شکل بھی اختیار کرلیتی ہیں اور جوانی میں ان کی بے راہ روی اور آوارگی والدین کے لئے بڑی صبر آزما ہوتی ہیں اور یہ صبر آزمائی کا دَور والدین میں قوتِ برداشت اور تحمل پیدا کرتا ہے کیونکہ بچے کتنے ہی شریر اور فتنہ پرور کیوں نہ ہوں عموماً والدین ان کی اصلاح کی کوشش کو ترک نہیں کرتے اور مستقل مزاجی

سے انھیں درست کرنے کی جدوجہد میں لگے ہی رہتے ہیں بچے عموماً والدین کو خدا سے قریب کرنے کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں اور وہ اس طرح کہ ان کے دُکھ بیماریاں اور دوسری تکلیفیں والدین کو غم والم میں مبتلا کر کے ان کے دلوں میں وہ نرمی پیدا کر دیتی ہیں جن سے وہ خدا کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

پھر میاں بیوی بھی عموماً دو الگ الگ خاندانوں کے افراد ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دونوں خاندانوں کے طور طریقوں میں بہت زیادہ فرق ہو۔ یہ علیٰحدہ علیٰحدہ مزاج رکھنے والے انسان جب مل کر گھر بناتے ہیں تو قدم قدم پر باہمی کشمکش کا خطرہ موجود ہوتا ہے۔ اب اگر انھیں ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرنا ہے تو دونوں کو کچھ نہ کچھ ڈھلنا پڑے گا اور اس طرح وہ سمجھوتہ وجود میں آئے گا جو نباہ کے لئے ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حالات ان دونوں میں یہ صلاحیت پیدا کرے گی کہ ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر اپنے اپنے ذاتی میلانِ طبع کو ایک حد تک دباتے رہیں۔

اس کے علاوہ ایک عام نارمل لڑکی کے اندر گھر چلانے اور گھر کو بہتر سے بہتر شکل میں لانے کا مادّہ عموماً موجود ہوتا ہے۔ والدین کے گھر میں بسا اوقات اس صلاحیت کے پوری طرح نشوونما پانے اور اُبھرنے کا موقع موجود نہیں ہوتا، مگر وہی لڑکی جب ایک ایسے گھر کی مالک بنتی ہے جہاں اس کی اپنی پالیسی نے چلنا ہوتا ہے، تو پھر یہ صلاحیت پورے طور پر بروئے کار آجاتی ہے۔

ازدواجی زندگی اختیار کرنے کے بعد اگرچہ مرد اور عورت دونوں ہی کو بعض دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تاہم عورت اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی آزمائشوں کا شکار ہوتی ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد تو شادی کے بعد بھی اپنے اُسی پُرانے ماحول میں رہتا ہے جس کا وہ پہلے سے عادی ہوتا ہے اور جہاں کے رہنے والوں کے مزاج و طبع سے وہ پہلے ہی سے واقف ہوتا ہے مگر عورت شادی کے بعد عموماً ایک بالکل اجنبی ماحول میں گھر جاتی ہے جہاں اُسے صرف شوہر ہی کی نہیں بلکہ اس کے بے شمار رشتے داروں کی بھی مزاج شناسی کرنی پڑتی ہے۔ اب اگر وہ ایک خدا ترس خاتون ہے اور رشتے داروں کے حقوق سے واقف ہے تو

اُن حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں اسے جس طرح اپنی طبیعت پر جبر کرنا اور اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا پڑتا ہے، اس سے اس کے باطن میں پاکی، وسعت اور صبر و تحمل پیدا ہوتا ہے اور اس کی روح کو قوت پہنچتی ہے۔

غرضیکہ شادی شدہ زندگی میں انسان ایک سال کے اندر اتنا کچھ سیکھ لیتا ہے اور اپنی اتنی اصلاح کر لیتا ہے جو مجرد رہنے کی صورت میں شاید وہ عمر بھر میں بھی نہ کر سکتا۔

۴۔ اشاعتِ دین

ازدواجی زندگی اختیار کرنے کا ایک اور بڑا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کو دین کی خدمت کا موقع ملتا ہے۔ اللہ کے کلمے کو ماننے والوں کی تعداد بڑھانے کے دو طریقے ہیں؛ ایک یہ کہ غیر مسلموں پر تبلیغ کی جائے تاکہ وہ مسلمان بنیں اور دوسرے یہ کہ اسلامی معاشرے کے اندر مسلمانوں کی تعداد بڑھے۔ ازدواجی زندگی اسلامی معاشرے کے اندر مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کا ذریعہ بن کر دین کو قوت بہم پہنچاتی ہے۔ ایک کلمہ گو مرتے وقت کئی اور کلمہ گو اپنی جگہ چھوڑ جاتا ہے جو فوراً اس کی کمی پوری کر دیتے ہیں۔

پھر والدین نے چونکہ بچوں کی صرف جسمانی دیکھ بھال ہی نہیں کرنی ہوتی بلکہ انہیں دینی، اخلاقی اور روحانی تربیت بھی دینی ہوتی ہے اس لئے وہ غیر ارادی طور پر، کسی حد تک تبلیغِ دین کا حق ادا کرتے رہتے ہیں۔ بچے ایک لمبے عرصے کے لئے والدین کی امداد کے محتاج رہتے ہیں، یہ مدد کی احتیاج انہیں ماں باپ سے چمٹائے رکھتی ہے۔ لہٰذا اگر ماں باپ ذرا بھی فرض شناسی سے کام لیں تو وہ اس دوران میں دین کی بہت سی بنیادی باتیں بچوں کے ذہن میں راسخ کر سکتے ہیں۔ بچپن کے نقش کتنے گہرے ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آخر کوئی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے بچے کی پیدائش کے بعد اُسے کچھ کھلانے پلانے سے بھی پہلے اس کے ایک کان میں اذان اور دوسرے میں اقامت کہنے کا حکم دیا ہوا ہے۔

دیگر فوائد

مندرجہ بالا فوائد کے علاوہ بھی ازدواجی زندگی اپنے اندر بہت زیادہ خیر و برکت رکھتی ہے۔ مثلاً اس نظام کے باعث مرد اور عورت دونوں کو ایک ایسا ٹھکانہ مل جاتا ہے جہاں وہ سکون اور آرام حاصل کرتے ہیں اور باہر کی زندگی کی بہت سی بے چینیوں سے مامون رہ کر راحت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

اسی نظام کی برکت ہے کہ جب بوڑھے والدین دنیا سے رختِ سفر باندھتے ہیں تو انہیں اطمینان ہوتا ہے کہ اُن کی بچیوں کے سروں پر ایسے محافظ موجود ہیں جو اُن کی حفاظت کرنے اور اُن کی ہر طرح کی ضروریات کو پورا کرنے کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں اور اُن کے بیٹوں کے گھروں میں وہ سچی ہمدرد ہستیاں موجود ہیں جو دلی توجہ سے اُن کے گھر بار کی حفاظت کریں گی، ہر طرح سے ان کی راحت و آرام کا دھیان رکھیں گی اور زندگی کے سفر میں اُن کی رفاقت کا حق ادا کریں گی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس نظام کو فراخیٔ رزق کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہر انسان کے حصّے کا رزق خدا کی طرف سے معین ہو چکا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دو ایسے انسان مل کر زندگی کا سفر اختیار کرتے ہیں جن میں سے کسی ایک کے حصّے میں اللہ تعالیٰ نے زیادہ رزق لکھا ہوتا ہے اور پھر اس ایک کے حصے کے رزق سے سارا گھر فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ویسے بھی شادی کے بعد کام کرنے والے ہاتھ بڑھ جاتے ہیں اور جیسے جیسے وقت گزرتا ہے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جس تناسب سے کام کرنے والے ہاتھوں کی تعداد بڑھتی ہے اسی تناسب سے گھر میں خدا کی مہربانی سے رزق بھی فراواں ہوتا جاتا ہے۔ معاشرے میں یہ منظر جگہ جگہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ہونہار اولاد نے غریب گھروں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔

اوپر سورۂ نور کی ایک آیت بیان کی گئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے مجرد لوگوں کے نکاح کر دینے کا حکم دیا ہے۔ اسی آیت میں آگے فرمایا گیا ہے:

إِنْ يَكُونُوا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ "اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے

اللہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَاللہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ○

انہیں غنی کردے گا۔ اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے۔"

زوجین کے باہمی تعلق کی گہرائی

سورۃ البقرہ آیت ۱۸۷ میں مردوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ

"وہ (عورتیں) تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔"

یہاں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے۔ اس تشبیہہ کی وجوہِ تشبیہہ حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ لباس اور جسم میں انتہائی قرب اور اتّصال ہوتا ہے، اسی طرح شوہر اور بیوی کے درمیان بھی قرب اور اعتمادِ باہمی ہونا چاہیئے۔ جہاں میاں بیوی کے درمیان یگانگت اور دُوری ہوگی وہاں ایک طرف تو زندگی بوجھ بن جائے گی اور دوسری طرف اُس گھر نے معاشرے کو جو فائدہ پہنچانا ہوگا وہ کم ہو جائے گا۔

۲۔ لباس جسم کا رازدار، پردہ دار اور پردہ پوش ہوتا ہے، ایسے ہی زوجین کو ایک دوسرے کا رازدار، پردہ دار اور پردہ پوش ہونا چاہیئے، جہاں خاوند بیوی کے راز فاش کرتا رہے اور بیوی خاوند کے، وہاں دونوں ہی معاشرے کی نگاہوں سے گر جاتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے خالق کی نگاہوں سے بھی۔

۳۔ لباس انسان کے لئے باعثِ زینت ہوتا ہے۔ اسی طرح شوہر اور بیوی بھی ایک دوسرے کے لئے باعثِ زینت ہوتے ہیں۔ جو کام مل جل کر کیا جا رہا ہو اُس میں دلکشی پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح زوجین کا بھی مل جل کر زندگی کی گاڑی کو چلانا خود زندگی کے حُسن کا باعث بنتا ہے۔ جب زندگی کا کوئی حادثہ زوجین کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کر دیتا ہے تو دونوں ہی اپنی اپنی جگہ غیر دلکش ہو کر رہ جاتے ہیں۔

۴۔ لباس جسم کی حفاظت کرنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اور اُسے سردی گرمی کے حملوں

سے بچاتا ہے۔ اسی طرح شوہر اور بیوی بھی ایک دوسرے کو انسانوں اور شیطانوں کے حملوں سے بچاتے ہیں۔ جہاں زوجین اکٹھے اتفاق کی زندگی گزار رہے ہوں وہاں لوگوں کو ان کے اخلاق اور چال چلن پر حملہ کرنے کی کم ہی جرائت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس تنہا مرد اور تنہا عورت کے لئے لوگوں کی نکتہ چینیوں، اعتراضات اور افترا و بہتان کا ہدف بن جانا نہایت آسان ہوتا ہے۔

زوجین کے ایک دوسرے پر جو حقوق ہیں اُن میں پہلی شے یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان نے انھیں ایک دوسرے کا لباس قرار دے کر اُن پر جو ذمہ داریاں ڈالی ہیں وہ انھیں اچھی طرح سمجھیں اور انہیں ادا کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اگر

زوجین ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے اور بیگانہ رہیں گے،
ایک دوسرے کے رازوں کی حفاظت نہیں کریں گے،
ایک دوسرے کے لئے باعثِ زینت نہیں بنیں گے،
اور ایک دوسرے کو انسانوں اور شیطانوں کے حملوں سے بچانے کی کوشش نہیں کریں گے؛

تو پھر

وہ اُن فرائض کو ادا نہیں کر رہے ہوں گے جو خدا نے اُن پر عائد کر رکھے ہیں اور جب وہ اپنے اُوپر عائد شدہ فرائض ادا کرنے سے پہلوتہی کریں گے تو پھر اُن کی زندگیوں میں لازماً تلخیاں گھُل کر رہیں گی اور وہ ان تلخیوں کے مستحق بھی ہوں گے۔

ازدواجی زندگی کی اہمیت کے سلسلے میں ایک اور بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ انسانی رشتوں میں جو رشتہ سب سے پہلے وجود میں آیا وہ شوہر اور بیوی ہی کا رشتہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو خلق کیا اور پھر ان کی رفاقت کے لئے حضرت حوّاؑ کو پیدا کیا۔ اس طرح جب انسان ایک سے دو ہوئے تو اُن کے درمیان جو رشتہ اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا وہ زوجین کا رشتہ تھا، پھر خدا تعالیٰ نے انہیں اولاد بخشی تو والدین، اولاد اور بہن بھائی کے رشتے وجود میں آئے، پھر جب تیسری نسل دنیا میں آئی تو دادا دادی، نانا نانی،

چچا پھوپھی، ماموں خالہ، بھتیجا بھتیجی، بھانجا بھانجی، پوتا پوتی، نواسا نواسی وغیرہ پیدا ہو گئے۔

لہٰذا اس حقیقت کے پیش نظر کہ انسانی رشتوں میں سب سے پہلا رشتہ زوجین کا تھا، اس کتاب میں مختلف طبقات کے حقوق بیان کرتے ہوئے آغاز حقوقِ زوجین ہی سے کیا گیا ہے، پھر زوجین میں سے بھی پہلے شوہر کے حقوق بیان کئے گئے، پھر بیوی کے اور اس کے بعد پھر دوسرے لوگوں کے۔

شوہر کے حقوق

۱۔ اطاعت و رضاجوئی

حضرت اُم سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس عورت نے اس حالت میں وفات پائی کہ اس کا شوہر اُس سے راضی تھا، وہ جنت میں داخل ہوگی۔ (ترمذی)

بعض نسخوں میں یہ حدیث یوں لکھی ہوئی ہے کہ

"جس عورت نے اس طرح رات گزاری کہ اس کا شوہر اُس سے راضی تھا وہ جنت میں جائے گی۔"

اب چاہے پہلا بیان لیا جائے یا دوسرا، دونوں صورتوں میں شوہر کا یہ حق واضح ہے کہ بیوی اس کی رضامندی کا دھیان رکھے۔ اب جس کی رضامندی حاصل کرنا ہوگی، ضروری ہے کہ اس کی اطاعت بھی کی جائے کیونکہ کسی شخص کی نافرمانی کرکے اس کی رضامندی حاصل نہیں کی جاسکتی۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت جب پانچوں وقت کی نماز پڑھے اور مہینہ بھر کے روزے رکھے اور اپنی عصمت و عفّت کی حفاظت کرے اور اپنے خاوند کی اطاعت کرے تو پھر (اُسے حق ہے کہ) بہشت کے جس دروازے سے چاہے اس میں داخل ہوجائے۔ (حلیہ ابونعیم)

عورت کو کیوں حکم دیا گیا کہ وہ خاوند کی اطاعت کرے؟

اس کی مصلحت کو سمجھنے کے لئے یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ جہاں کہیں بھی ایک سے زیادہ لوگ مل جل کر رہ رہے ہوں گے وہاں نظم وضبط قائم رکھنے کے لئے اور معاملات کو درست طریقے سے چلانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو سربراہ بنا دیا جائے۔ پھر اس سربراہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو حفاظت بھی بہم پہنچائے، اُن کی اُن ضروریات کا بھی بندوبست کرے جو وہ خود پوری نہ کر سکتے ہوں اور اس بات کا بھی دھیان رکھے کہ وہ لوگ ایک دوسرے کے حقوق نہ چھیننے پائیں اور ایک دوسرے پر دست درازی نہ کر سکیں۔ مختصر یہ کہ وہ سربراہ اس نظم اجتماعی کو عمدہ طریقے سے چلانے کا ذمہ دار ہوگا اور چونکہ اس کے کندھوں پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالا گیا ہوگا، اس لئے اُسے اس بوجھ کو اُٹھانے کے قابل بنانے کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ اُسے کچھ خصوصی اختیارات بھی دیے جائیں۔ کیونکہ اگر کسی سربراہ کے زیرِ نگرانی رہنے والے لوگ اُس کی اطاعت نہیں کریں گے تو وہ سربراہ اپنی ذمہ داریوں کو درست طریقے سے ادا نہیں کر سکے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس نظم اجتماعی میں خرابی اور فساد پیدا ہوگا جس سے اُن نافرمانی کرنے والوں کو بھی اتنی ہی تکلیف پہنچے گی جتنی اُسے، جس کی نافرمانی کی جائے گی۔

اب گھر بھی ایک نظم اجتماعی ہے۔ اس میں بھی ایک سے زیادہ لوگ مل جُل کر زندگی گزارتے ہیں۔ یہاں بھی ایک سربراہ کی ضرورت ہے جو یہاں کے معاملات کو درست رکھنے کا ذمہ دار ہو اور اس ذمہ دار سربراہ کے لئے بھی لازمی ہے کہ زیرِ نگرانی رہنے والے لوگ اس کی اطاعت کریں۔ مرد کی خصوصی صلاحیتوں اور اُن ذمہ داریوں کے باعث جو خدا نے اُس کے کندھوں پر ڈالی ہیں، یہ سربراہی کا منصب اُسے عطا کر دیا گیا تاکہ وہ گھر کی چھوٹی سی سلطنت کے معاملات درست رکھے اور اُس میں فساد نہ پیدا ہونے دے۔ سورۃ النساء آیت ۳۴ میں فرمایا گیا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ	”مرد عورتوں پر قوّام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے

عَلٰی بَعۡضٍ وَّ بِمَاۤ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَیۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ؕ

اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں پس جو نیک عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں اُن کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔"

اس آیت میں مرد کے لئے جو لفظ "قوّام" استعمال ہوا ہے اور اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اُسے "فضیلت" دی گئی ہے۔ تفہیم القرآن جلد اوّل میں ان دونوں لفظوں کی تشریح کر کے بتایا گیا ہے کہ "قوّام" کسے کہا جاتا ہے اور "فضیلت" سے یہاں کیا مراد ہے؟

"قوّام یا قیّم اُس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو درست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔"

یہاں فضیلت بمعنی شرف اور کرامت اور عزت نہیں ہے جیسا کہ ایک عام اُردو خواں آدمی اس لفظ کا مطلب لے گا بلکہ یہاں یہ لفظ اس معنی میں ہے کہ ان میں سے ایک صنف (یعنی مرد) کو اللہ نے طبعاً ایسی خصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں جو دوسری صنف (یعنی عورت) کو نہیں دیں یا اُس سے کم دی ہیں۔ اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی قوّام ہونے کی اہلیت رکھتا ہے اور عورت فطرتاً ایسی بنائی گئی ہے کہ اُسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت و خبر گیری کے تحت رہنا چاہیئے۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اُسے دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے۔ جب تم اُسے کسی کام کا حکم دو تو وہ تمہاری اطاعت کرے اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمہارے پیچھے تمہارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔ . . ."

اب بعض لوگوں کا سوچنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ وہ اطاعت کو ذلت کا ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں جسے اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اُسے گویا گھٹیا ثابت کیا گیا ہے۔ یہ اندازِ فکر بالکل غلط ہے۔ سربراہ کی اطاعت کا حکم تو اس لئے دیا جاتا ہے کہ جہاں لوگ مل جل کر زندگی گزار رہے ہیں وہاں معاملات درست رہیں۔ اس میں ذلت کا مفہوم کہاں سے پیدا ہو گیا۔

گھر کے تین عناصر میں سے ایک خاوند دوسرے بیوی اور تیسرے بچّے ہوتے ہیں۔ اب بیوی کو تو صرف خاوند کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے مگر بچوں کے لیئے یہ لازمی ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ باپ اور ماں دونوں کی اطاعت کریں، تو کیا اس سے یہ مفہوم لیا جائے گا کہ بچّے گھر کی ذلیل ترین ہستیاں ہیں حالانکہ وہی گھر کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ سمجھے جاتے ہیں ــــ اگر اطاعت بچّوں کے لئے ذلّت کا باعث نہیں بنتی تو پھر بیوی کے خاوند کی اطاعت کرنے پر ذلّت کا سوال کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے۔ آخر وہ اسی کی اطاعت تو کرتی ہے جو اُس کی حفاظت کرنے، اُس کی ضروریات پوری کرنے اور اُسے زندگی کی ہر سختی نرمی سے بچانے کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک نیک اور خدا شناس بیوی کے لئے خاوند کی اطاعت ذلّت کی نہیں بلکہ بڑے شرف اور اعزاز کی بات ہے۔ خاوند کی اطاعت کر کے وہ اپنے گھر کی ننّھی سی سلطنت کو عمدگی سے چلانے اور گھر کے بچوں کی بہتر تربیت ہونے میں جو امداد بہم پہنچاتی ہے وہ از حد قیمتی ہوتی ہے اور ایسی نیکو کار خاتون کے لئے یہی بشارت کافی ہے کہ خدا اور خدا کے رسولؐ نے اُس کے طرزِ عمل کو قابلِ تعریف سمجھا ہے۔

البتہ اطاعت کے بارے میں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ کسی انسان کو بھی یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ کسی ایسے حکم کی اطاعت کرنے کا مطالبہ کرے جو خدا تعالےٰ کے احکام کے خلاف ہو۔ لہٰذا خاوند کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بیوی کو کوئی خلافِ شرع حکم دے، نہ بیوی کو کسی ایسے حکم کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ مثلاً اگر کوئی خاوند بیوی کو شرک کرنے کا حکم دیتا ہے یا فسق و فجور کی طرف بلاتا ہے یا کسی بے راہروی کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے تو بیوی کو خاوند کے ایسے احکام ماننے کی قطعی ضرورت نہیں۔ کیونکہ انسان پر سب سے پہلا حق اس کے خالق کا ہے اور مخلوق میں سے جو شخص بھی کوئی ایسا حکم دے گا جو خالق کے احکام کے خلاف ہوگا اس کے حکم کو ردّ کر دیا جائے، چاہے یہ حکم دینے والا خاوند ہی کیوں نہ ہو!

ایک شوہر اگر بیوی کو حکم دیتا ہے کہ وہ فرض نماز نہ پڑھے یا فرض روزے نہ رکھے یا اپنے مال کی زکوٰۃ نہ نکالے تو بیوی کو ان امور میں اس کی اطاعت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ حضورؐ کے فرمان کے مطابق اگر کوئی خاوند بیوی کو نفل عبادت کرنے سے

روکے (مثلاً نفل نماز پڑھنے سے یا نفل روزے رکھنے سے) تو بیوی کو اس معاملے میں اس کی اطاعت کرنی چاہیئے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر (نفل) روزہ نہ رکھے۔۔۔۔ (مسلم)

بات اصل میں یہ ہے کہ نفل عبادت نہ کرنے سے کسی قسم کا گناہ نہیں ہوتا۔ یہ تو اس لئے ہوتی ہے کہ انسان اس کے ذریعے اپنے ثواب میں اضافہ کرلے۔ لہٰذا اگر بیوی کی کوئی نفل عبادت اس کے شوہر کے لئے باعثِ تکلیف ہے یا وہ کسی وجہ سے نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی نفل عبادت کرے تو ایک ثواب کی مشتاق بیوی وہ نفل عبادت کرکے ثواب حاصل کرنے کے بجائے خاوند کی اطاعت کرکے ثواب حاصل کرلے۔ اُس کا مقصد تو ثواب حاصل کرنا ہے اور ثواب اللہ تعالیٰ نے عطا کرنا ہے۔ لہٰذا جب وہ اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے نفل عبادت کے معاملے میں خاوند کی اطاعت کرے گی تو اللہ تعالیٰ اُسے اتنا ہی ثواب عطا فرمادیگا جتنا اسے نفل عبادت کرنے کی صورت میں ملنا تھا۔

یہ تو شوہر کی اطاعت کی بات تھی، اب اسے راضی رکھنے کے معاملے میں بھی یہ وضاحت ضروری ہے کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ خاوند کو راضی رکھنے کی کوشش کرتی رہے۔ اب بعض خاوند اگر اپنی فطری بدمزاجی کے باعث خواہ مخواہ ہی ناراض رہتے ہوں اور کسی صورت بھی راضی ہونے میں نہ آتے ہوں تو بیوی کو اس معاملے میں معذور سمجھا جائے گا۔

یہاں اس بنیادی بات کو ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ اسلام میں درحقیقت مقصود خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ پھر اس کی خوشنودی کے حصول کی خاطر وہ کام کئے جاتے ہیں جنہیں خدا نے اپنی خوشنودی کے حصول کے ذرائع قرار دیا ہے اور اُن میں ایک خاوند کی اطاعت بھی ہے۔ ایک سچی مومنہ خاوند کی اطاعت بھی اس لئے کرتی ہے کہ اس کے ذریعے مجھے خدا کی رضا حاصل ہو اور جس کی رضامندی اس کا اصل مقصود ہے وہ اس کی نیت اور کوششوں کو ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا جب وہ سچے دل سے خاوند کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہے گی، مگر خاوند بے وجہ ناراض رہے گا تو اللہ تعالیٰ خاوند کی

ناراضی کے باوجود اُسے اپنی رضا سے سرفراز فرمائے گا اور یہی اس نیکو کار خاتون کا اصل مقصد تھا:

سورۃ البقرہ آیت ۲۲۸ میں فرمایا گیا ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○

"عورتوں کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے اور اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور دانا ہے۔"

مفسرین کرام نے اس ایک لفظ "درجہ" پر بہت کچھ اظہارِ خیال فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہی ہے کہ مرد کو عورت پر ایک حد تک فوقیت حاصل ہے اور اس فوقیت ہی کا نتیجہ ہے کہ گھر کی سلطنت کی سربراہی اُسے عطا کی گئی ہے۔ اس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے دو صفاتی نام بیان کیے گئے ہیں۔ ایک "عزیز" یعنی زبردست اور دوسرا "حکیم" یعنی دانا۔ قرآن پاک پر نگاہ رکھنے والے بتاتے ہیں کہ کسی آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے جو صفاتی نام بیان کیے جاتے ہیں اُن کا اُس آیت میں بیان کردہ مفہوم سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں عورتوں کے حقوق و فرائض کا ذکر کر کے اور مردوں کے اُن پر ایک درجہ فائق ہونے کا اعلان فرما کر ساتھ ہی جو بتا دیا گیا ہے کہ خدا "زبردست" اور "دانا" ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ مرد کو جو ایک درجہ فائق رکھا گیا ہے تو اس سے وہ فائق ترین نہیں ہو گیا بلکہ اُس کے اُوپر ایک اور زبردست ہستی موجود ہے جس نے اُسے ایک درجہ فوقیت عطا کی ہے اور جو دیکھ رہی ہے کہ وہ اس "درجے" سے صحیح کام لے رہا ہے یا نہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ کی صفتِ زبردستی بیان کرنے کے ساتھ ہی جو اسے "دانا" بھی کہا گیا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس کا دونوں جنسوں میں سے ایک کو "درجہ" عطا کرنا دانائی پر مبنی ہے اور اسی میں دونوں جنسوں کی نجات ہے، جو کوئی اس "درجہ" کا انکار کر کے اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ مرد و زن دونوں ہر لحاظ سے ایک ہی سطح پر ہیں وہ گویا نعوذ باللہ، اس دانا کی دانائی کو چیلنج کرتا ہے اور اس سے بڑھ کر دانا ہونے کا دعویٰ

کرتا ہے اور ایسا کر کے وہ عورت کے ساتھ ہمدردی نہیں بلکہ دشمنی کرتا ہے کہ اُس کے
کندھوں پہ وہ بوجھ لادنے کی کوشش کرتا ہے جو خدا نے بتقاضائے دانائی اُس پر
نہیں ڈالا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد کو یہ "درجہ" دیا جانا عورت کے لئے بہت زیادہ سہولت
اور آرام کا باعث ہے اور اس طرح وہ اپنے فرائض منصبی کو بدرجہا بہتر طور پر سرانجام
دے سکتی ہے۔ لہٰذا ایک مومن عورت جب شوہر کے اس "درجہ" کو تسلیم کرتی اور اس کی
اطاعت کرتی ہے تو وہ درحقیقت اس زبردست اور دانا ہستی کی اطاعت کرتی ہے جس
نے اپنی برتر مصلحتوں کے باعث شوہر کو یہ "درجہ" عطا کیا ہے۔

۲۔ شکر گزاری

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کی ایک روایت بیان ہوئی ہے کہ رسولِ خدا
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عورتوں کے گروہ! خدا کی راہ میں خرچ کیا کرو اور
کثرت سے گناہوں کی بخشش مانگا کرو، کیونکہ میں نے اہل دوزخ میں تمہاری اکثریت
دیکھی ہے۔ (اس پر) ان خواتین میں سے ایک نے، جو زوردار بات کرنے والی تھی، عرض
کیا کہ یا رسولؐ اللہ! اہلِ دوزخ میں ہمارا حصّہ زیادہ کیوں ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ اس
لئے کہ تم کثرت سے لعنت کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو۔ ۔ ۔ ۔ (مسلم)

اسی مضمون کی ایک حدیث بخاری میں بھی بیان ہوئی ہے جس کے راوی حضرت
ابنِ عباسؓ ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے دوزخ
دکھائی گئی تو میں نے دیکھا کہ اس میں رہنے والوں میں اکثریت عورتوں کی ہے (وجہ
یہ ہے کہ) وہ کفر کرتی ہیں۔ حضورؐ سے پوچھا گیا کہ کیا وہ خدا کا کفر کرتی ہیں؟۔ آپؐ نے
فرمایا کہ (نہیں بلکہ) شوہر کا کفر کرتی ہیں اور (اس کا) احسان نہیں مانتیں (اے مخاطب)
اگر تو ان میں سے کسی کے ساتھ زمانۂ دراز تک احسان کرتا رہے پھر وہ تم سے کوئی ....
(ناپسندیدہ) بات دیکھ لے تو (فوراً) کہے گی کہ میں نے تو تم سے کبھی بھلائی پائی ہی نہیں۔
اس حدیث میں حضورؐ نے ایک ایسی حقیقت بیان فرمائی ہے جس کا کوئی خداترس،

انصاف پسند انسان انکار نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ناشکرا پن انسان میں بہ حیثیت مجموعی بہت زیادہ پایا جاتا ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ خواتین میں یہ صفت کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہے خصوصاً شوہروں کے معاملوں میں۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ اُن کی ذرا سی بے انصافی کے پیشِ نظر اُن کی عمر بھر کی خدمات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ خواتین کا یہ مخصوص فقرہ عام ہے کہ ——

"میں نے تو اس گھر میں آکر کبھی آرام پایا ہی نہیں!"

جو کچھ حضورؐ نے خواتین کو مخاطب کر کے فرمایا تھا اس سے مقصود عورتوں کی تادیب و تربیت تھی۔ ایک سچّی مومنہ کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی شکر گزار ہونے کے علاوہ ان انسانوں کی بھی شکر گزار ہو جو اس کی خاطر مشقت کرتے ہیں اور اُسے راحت و آرام پہنچانے اور اُس کی ضروریات کو پورا کرنے کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔ شادی سے پہلے یہ محسن لوگ والدین ہوتے ہیں اور شادی کے بعد شوہر۔

بلاشبہ گھر کے اندر ایک عورت کے کندھوں پر بھی بہت زیادہ ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور ایک فرض شناس عورت اُن سے عہدہ برآ ہونے میں اپنے جسم و جان کی ساری طاقتیں کھپا دینے سے دریغ نہیں کرتی، لیکن اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ جس محفوظ ماحول میں وہ یہ ساری ذمہ داریاں سرانجام دیتی ہے اُسے محفوظ رکھنے اور اس کے قائم رہنے کے ذرائع اور اسباب بہم پہنچانے کے لئے تگ و دو کرنے والی ہستی مرد ہی کی ہوتی ہے۔ رازق اور محافظ تو درحقیقت اللہ پاک ہی ہے مگر لوگوں کو روزی اور حفاظت بہم پہنچانے کے جو مادّی ذرائع اس نے بنا رکھے ہیں ان میں اہلِ خانہ کے لئے روزی کمانے والا اور اُن کی حفاظت کرنے والا مرد نہایت معزز، ذمہ دار اور قابلِ اعتبار ذریعہ ہے۔ صرف اسی کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے گھر اتنا غیر محفوظ اور بے آسرا سا ہو جاتا ہے کہ دوسرے بہت سے لوگ مل کر بھی اُس کی کمی کو صحیح معنوں میں پورا نہیں کر سکتے۔ پھر مرد کی ذات کے اس افادی پہلو سے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھانے والی ہستی اس کی بیوی ہی ہوتی ہے۔ اس لئے جو خاتون حقیقت شناس، انصاف پسند اور خدا ترس ہو گی اس کے دل میں

اُس ہستی کے لئے شکر گزاری کے جذبات ضرور پیدا ہونے چاہئیں جس کی ذات اُسے معاشرے میں ایک رتبہ عطا کرتی ہے اور زندگی کی بے شمار بلاؤں کے خلاف اُس کے لئے ایک قلعے کا کام دیتی ہے۔

۳۔ حفاظت

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت بیان ہوئی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اونٹ پر سوار ہونے والی عورتوں میں سے بہترین عورتیں (قبیلۂ) قریش کی ہیں (کیونکہ وہ) بچے پر اس کی کم سنی میں بہت مہربان (ہوتی ہیں) اور شوہر کے ہاتھ میں جو مال ہو اُس کی بہت زیادہ حفاظت کرتی ہیں۔

اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضورؐ نے جن خواتین کو قابلِ تعریف سمجھا اُن میں یہ دو صفات پائی جاتی تھیں کہ وہ بچوں پر بہت مہربان تھیں اور گھر بار کی خوب حفاظت کرتی تھیں۔

چونکہ مرد کے کندھوں پر روزی کمانے کا بوجھ ہوتا ہے اس لئے اُس کے لئے ممکن نہیں کہ ہر وقت گھر اور گھر کے ساز و سامان وغیرہ کی حفاظت کر سکے۔ اس کی غیر موجودگی میں کوئی ایسا ہونا چاہیئے جو اس بات کا ذمہ دار ہو کہ گھر بار اور بچوں وغیرہ کی حفاظت کرے۔ لہٰذا عورت پر مرد کا یہ بھی ایک حق ہے کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں ان چیزوں کی حفاظت کرے۔ حفاظت کی جانے والی چیزوں میں سب سے زیادہ قیمتی شئے عورت کی اپنی عزت و آبرو ہے۔ لہٰذا ایک دیندار خاتون اس بات میں کوشاں رہتی ہے کہ اُس کی اپنی عزت و آبرو پر بھی کوئی آنچ نہ آنے پائے اور اس کے گھر کی مادّی اشیاء بھی محفوظ رہیں۔

سورۃ النساء آیت ۳۴ میں فرمایا گیا ہے:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ

"پس جو نیک عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں اُن کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔"

تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۳۴۸ پر اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے بیان ہوا ہے:
"حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اُسے دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے، جب تم اُسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمہاری اطاعت کرے اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمہارے پیچھے تمہارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے ـــــ یہ حدیث اس آیت کی بہترین تفسیر کرتی ہے۔"

۴۔ حقِ طلاق

ایک اور حق جو مرد کو دیا گیا ہے وہ حقِ طلاق ہے جس کے ذریعے وہ نکاح کے معاہدے کو ختم کر سکتا ہے۔ طلاق کے بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلام میں اس کی اجازت دی گئی ہے مگر اسے پسندیدہ نہیں سمجھا گیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سے سب سے بُری چیز طلاق ہے۔ (ابوداؤد)

اس حکیمانہ مقولے کے ذریعے یہ بھی واضح فرما دیا گیا ہے کہ طلاق حلال ہے اور ساتھ ہی یہ تنبیہہ بھی کر دی گئی ہے کہ اسے کھیل نہ بنا لیا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے جائز تو قرار دیا ہے مگر اسے پسند نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ناپسند کرنے کے باوجود جائز کیوں قرار دیا؟ ـــــ اس لئے کہ بعض اوقات حالات ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خرابی پیدا ہو جاتی ہے کہ مصالحت کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔ تو پھر ایسی صورت میں آخری چارۂ کار کے طور پر طلاق سے کام لیا جا سکتا ہے کیونکہ اگر میاں بیوی کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے اتنی نفرت پیدا ہو چکی ہو کہ وہ ایک دوسرے کے وہ حقوق ادا نہ کر سکتے ہوں جو اسلام نے قائم کئے ہیں تو پھر بجائے اس کے کہ عمر بھر دونوں کی زندگی اجیرن رہے، یہ بہتر ہے کہ وہ ایک دوسرے سے قانونی علیحدگی اختیار کر کے اپنا اپنا کوئی اور بندوبست کر لیں۔

تاہم جیسے کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، طلاق کو کھیل بنا لینا سخت ناپسندیدہ امر ہے ـــ مسلمان عورتوں کو بھی تلقین فرمائی گئی ہے کہ بے ضرورت طلاق نہ مانگا کریں اور ایسے ہی یہ بھی

ناپسندیدہ ہے کہ کوئی عورت کسی دوسری عورت کو طلاق دیے جانے کا مطالبہ کرے۔

حضرت ثوبانؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورت بے ضرورت اپنے خاوند سے طلاق مانگے اُس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عورت کے لئے جائز نہیں کہ اپنی (مسلمان) بہن کی طلاق کا مطالبہ کرے تاکہ اُس کی رکابی کو اپنے لئے حاصل کرے کیونکہ اُس کی تقدیر میں جو کچھ ہوگا وہ اسے مل جائے گا۔ (بخاری)

۵۔ عورت کا اعتدال کے ساتھ آرائش و زیبائش کرنا

انسان طبعاً حسین اور دل کش چیزوں کو پسند کرتا ہے اور اس کا دل غیر ارادی طور پر اُن کی طرف کھنچتا ہے۔ اُس کی فطرت میں یہ خواہش ودیعت کی گئی ہے کہ وہ اشیاء کو بہتر سے بہتر شکل میں لائے۔ حُسن اور دل کشی بہت حد تک تو قدرتی ہوتی ہے مگر کسی حد تک سنگھار اور زیبائش کے ذریعے پیدا بھی کی جا سکتی ہے اور اگر اس کے لئے غیر شرعی طریقے اختیار نہ کیے جائیں تو یہ ایک بالکل جائز امر ہے۔

عورت فطرتاً سنگھار کو پسند کرتی ہے اور اسلام نے، جو دینِ فطرت ہے، عورت کی اس خواہش کو دبایا نہیں بلکہ اس کی اجازت عطا فرمائی ہے مگر کچھ پابندیوں کے ساتھ۔

اس سلسلے میں پہلی پابندی یہ ہے کہ سنگھار غیر اسلامی نہ ہو۔ سنگھار کے غیر اسلامی ہونے سے یہ مراد ہے کہ ایسا لباس استعمال نہ کیا جائے جو جسم کے اُن حصّوں کو کھول دے جنہیں ڈھانپ کر رکھنے کا حکم ہے اور وہ سنگھار ایسا بھی نہ ہو جو اسلامی عبادت میں حارج ہوتا ہو۔ مثلاً لباس کی کٹائی ایسی ہے کہ اسے پہن کر نماز ہی نہیں پڑھی جا سکتی یا ایسی سنگھاری اشیاء استعمال کی جا رہی ہیں جن کی موجودگی میں وضو ہی درست نہیں ہوتا۔ وغیرہ۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ سنگھار کی دُھن میں اپنے وسائل کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ بعض خواتین کی یہ خواہش اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ وہ خوبصورت قیمتی لباس اور زیب و زینت کی دوسری اشیاء کے لئے قرض کے پھندے میں پھنس جانے اور گھر برباد کر لینے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔

یہ امر سخت ناپسندیدہ ہے اور اس سے انسان ایک حلال شے کو خرابی کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ حالانکہ جو شے حلال ہے اس کا حلال ہونا ہی ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ خرابی کا ذریعہ نہیں بنے گی۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ مومن عورتوں کا سنگھار محرم آنکھوں کے لئے ہو، نامحرموں کے لئے نہ ہو۔

سورۃ الاحزاب آیت ۳۳ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ۔ "اور سابق دورِ جاہلیت کی طرح سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔"

اس کی تشریح میں واضح کیا گیا ہے کہ:

"عورت کے لئے جب لفظ "تبرّج" استعمال کیا جائے تو اس کے تین مطلب ہوں گے: ایک یہ کہ وہ اپنے چہرے اور جسم کا حسن لوگوں کو دکھائے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے لباس اور زیور کی شان دوسرے کے آگے نمایاں کرے۔ تیسرے یہ کہ وہ اپنی چال ڈھال اور چٹک مٹک سے اپنے آپ کو نمایاں کرے۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ جس طرزِ عمل سے عورتوں کو روکنا چاہتا ہے وہ اُن کا اپنے حسن کی نمائش کرتے ہوئے گھروں سے باہر نکلنا ہے، وہ اُن کو ہدایت فرماتا ہے کہ اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو، کیونکہ تمہارا اصل کام گھر میں ہے نہ کہ اس سے باہر۔ لیکن اگر باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو اس شان کے ساتھ نہ نکلو جس کے ساتھ سابق دورِ جاہلیت میں عورتیں نکلا کرتی تھیں۔ بن ٹھن کر نکلنا، چہرے اور جسم کے حسن کو زیب و زینت اور چست لباسوں یا عریاں لباسوں سے نمایاں کرنا اور ناز و ادا سے چلنا، ایک مسلم معاشرے کی عورتوں کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہلیت کے طور طریقے ہیں جو اسلام میں نہیں چل سکتے۔"

(تفہیم القرآن، جلد ۴، صفحہ ۹۱، ۹۲)

غرضکہ شریعت کی پابندیوں کو ملحوظ رکھ کر سنگھار کرنا عورت کے لئے بالکل جائز ہے۔ اور بیوی کا شوہر کے لئے سنگھار کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ پسندیدہ ہے۔

حضرت ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں: "مجھے یہ بات پسند ہے کہ میں اپنی بیوی کے لئے

آراستہ رہوں جس طرح میں یہ پسند کرتا ہوں کہ وہ میرے لئے آراستہ رہے۔"

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ شوہر کا ایک حق یہ بھی ہے کہ بیوی اپنے وسائل اور شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی زیب و زینت کا دھیان رکھے۔ اس سے توقع رکھی جاتی ہے کہ باہمی تعلقات زیادہ خوشگوار ہوں گے اور مردوں کے خیالات آوارگی کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔

ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے حضرت عثمان بن مظعون کی اہلیہ محترمہ کو دیکھا کہ نہایت سادہ لباس میں ہیں اور بناؤ سنگھار بھی بالکل نہیں کیا ہوا تو حضرت عائشہ رضؓ نے تعجب سے پوچھا کہ بی بی، کیا عثمان کہیں باہر سفر پر گئے ہوئے ہیں؟

جناب صدیقہؓ کے اس تعجب سے واضح ہو جاتا ہے کہ سہاگنوں کا اپنے شوہروں کے لئے زیب و زینت کرنا صحابیاتؓ کے نزدیک بھی ایک پسندیدہ فعل تھا۔

دیگر حقوق

مندرجہ بالا حقوق کے علاوہ مرد کو کچھ اور حقوق بھی حاصل ہیں۔ مثلاً یہ کہ بیوی شوہر کی کمائی کو اس کی مرضی کے خلاف خرچ نہ کرے۔ اس حکم کی مصلحت سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو مالی لحاظ سے مضبوط کیا ہے۔ وہ والدین سے ورثہ لیتی ہے اور جو کچھ وہ والدین سے لے وہ پورے طور پر اس کی اپنی ملکیت ہوتا ہے۔ اس کے خاوند کا اس پر کچھ حق نہیں ہوتا، پھر وہ خاوند سے مہر وصول کرتی ہے اور قرآن کریم کی رُو سے اگر کوئی خاوند مہر میں بیوی کو ڈھیروں سونا دے چکا ہو تو اس میں سے بھی وہ کچھ واپس نہیں لے سکتا۔ یہ عورت کی اپنی ملکیت ہے اور اس میں تصرف کا اُسے پورا حق حاصل ہے، پھر عورت کے کندھوں پر کوئی مالی بوجھ نہیں ڈالا گیا بلکہ خود اس کی کفالت بھی مرد کے ذمے ہے۔ اس لئے یہ عین انصاف ہے کہ مرد کی کمائی کو خرچ کرتے ہوئے وہ اس کی مرضی کا دھیان رکھے۔ جس شخص پر ذمہ داریاں ڈالی جاتی ہیں، ضروری ہے کہ اُسے کچھ اختیارات بھی دیے جائیں تاکہ وہ ذمہ داریوں کے اُس بوجھ کو اچھی طرح اُٹھا سکے۔

لہٰذا مرد اگر اس بات کا مکلّف ہے کہ اہل و عیال کے اخراجات پورے کرے تو پھر اُسے یہ حق بھی ہونا چاہیئے کہ اخراجات پر نظر رکھ سکے تاکہ وہ اتنے نہ بڑھ جائیں کہ ان کے لئے جتنی دولت کی ضرورت ہو اتنی دولت وہ مہیّا نہ کر سکتا ہو اور پریشانیوں کا شکار ہو جائے یا ناجائز کمائی کی طرف مائل ہونے کے خطرے میں مبتلا ہو جائے۔

ایسے ہی مرد کو حقِ وراثت بھی حاصل ہے۔ اگر بیوی اس کی زندگی میں وفات پا جائے تو وہ اس کے ترکے کے وارثوں میں سے ایک وارث ہوگا۔

ورثے کا اصول یہ ہے کہ اگر متوفی بیوی کی اولاد موجود ہو تو شوہر کو اس کے ترکے کا چوتھا حصّہ ملے گا اور اگر وہ بے اولاد ہو تو شوہر اس کے ترکے کے نصف کا حقدار ہوگا۔

یہ وہ نمایاں حقوق ہیں جو اسلام نے بیوی کے مقابلے میں شوہر کو عطا کئے ہیں مگر اللہ رب العلمین تو مرد عورت دونوں کا خدا ہے۔ لہٰذا جس طرح اس نے بیوی کے مقابلے میں شوہر کو حقوق عطا کئے ہیں اسی طرح شوہر کے مقابلے میں بیوی کو بھی عطا کئے ہیں۔

بیوی کے حقوق

۱۔ کفالت

عورت کے خاوند پر جو حقوق ہیں اُن میں پہلا حق یہ ہے کہ خاوند اُس کی کفالت کرے۔ فقہاء اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے بتاتے ہیں کہ عورت کے سب ضروری اخراجات مرد کے ذمے ہیں۔ مثلاً غذا، لباس، رہائش وغیرہ اور مرد کو اپنی استطاعت کے مطابق ان اخراجات کو پورا کرنا ہوگا۔

حکیم بن معاویہ القشیری کے باپ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے خدا کے رسولؐ! ہم میں سے کسی پر اس کی بیوی کا کیا حق ہے ــــــ حضورؐ نے فرمایا کہ (بیوی کا تم پر یہ حق ہے کہ) جب تو خود کھائے تو اُسے بھی کھلائے اور جب تو خود پہنے تو اُسے بھی پہنائے اور اس کے چہرے پر نہ مار اور اُسے بُرا نہ کہہ اور اُسے جُدا نہ کر مگر گھر کے اندر ہی۔ (ابوداؤد)

خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر جب حضورؐ امت کو زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے احکام دے رہے تھے تو عورتوں کے متعلق آپؐ نے جو نصیحتیں فرمائیں اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ:

"اُن کا روٹی کپڑا دستور کے موافق تم پر واجب ہے۔" (مسلم)

بیوی کے اخراجات خوش دلی سے پورے کرنے پر شوہروں کو ثواب کی بشارت

دی گئی ہے تاکہ وہ دلی اشتیاق سے اس فریضے کو ادا کریں۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جو کچھ بھی خرچ کروگے اُس کا تمہیں ثواب دیا جائے گا
یہاں تک کہ جو (لقمہ) تم اپنی بیوی کے منہ میں دوگے (اس کا بھی تمہیں ثواب ملے گا)۔
(بخاری)

حضرت ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مرد
خالص خدا کی رضامندی چاہنے کے لئے اپنی بیوی (یا اپنے گھر والوں) پر خرچ کرے تو وہ
خرچ کرنا اُس کے لئے خیرات کا حکم رکھتا ہے (جس کا اسے ثواب ملے گا۔) (بخاری)

بعض مردوں کی تنگی کے باعث یا کسی اور وجہ سے بیویوں کو اتنا خرچ نہیں دیتے جو
اُن کی ضروریات کے لئے پورا ہو سکے۔ ایسی صورت میں اگر بیوی شوہر کے مال میں سے
بتیر اُسے بتائے لے لے تو حرج نہیں بشرطیکہ اتنا ہی لے جو اُسے کفایت کرے۔

حضرت عائشہؓ نے ایک روایت بیان کی ہوئی ہے جس میں انھوں نے ابو سفیانؓ کی بیوی
ہندؓ کے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کا بتایا ہے۔ اس روایت کے آخر میں بیان ہوا ہے کہ:

"ہند نے عرض کیا کہ اے خدا کے رسولؐ! ابو سفیان ایک کنجوس آدمی ہیں۔ اگر میں اُن
کے مال میں سے کچھ اُن کی اجازت کے بغیر اُن کے بچوں پر صرف کر لیا کروں تو کیا مجھے گناہ
ہوگا؟ —— حضورؐ نے فرمایا کہ تجھے کوئی گناہ نہیں ہوگا، بشرطیکہ تو اُن پر معروف طریقے کے
مطابق صرف کرے۔" (مسلم)

لہٰذا جو شوہر بیوی کے اُن اخراجات کو پورا نہیں کرے گا جو شریعت نے اس پر لازم
کیے ہیں اُسے اسلامی عدالت مجبور کرے گی کہ وہ اپنا یہ فریضہ ادا کرے۔

۲۔ مہر

سورۃ النساء آیت نمبر ۴ میں مردوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ "اور عورتوں کے مہر خوش دلی سے (فرض جانتے

نِحْلَۃً ط   ہوئے) ادا کرو۔

چنانچہ بیوی کا شوہر پہ ایک حق یہ بھی ہے کہ اس سے مہر وصول کرے۔ اسلامی شریعت میں مہر باندھنا ضروری قرار دیا گیا ہے اور باندھنے کو ضروری قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اسے پھر ادا بھی کیا جائے۔ ہمارے ہاں اب یہ صورت ہے کہ مہر باندھنے کو تو ضروری ہی قرار دیا جاتا ہے مگر اس کی ادائیگی کو قطعی غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ بہت کم خاندان ایسے ہوں گے جہاں بیوی کو باضابطہ مہر ادا کیا جاتا ہو، زیادہ تر یہ شئے کاغذ ول ہی پر رہتی ہے۔ ہاں جب بد قسمتی سے کوئی نکاح ٹوٹتا ہے تو پھر مہر کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جاتا ہے گویا مہر کا تعلق نکاح سے نہیں بلکہ طلاق سے ہے لہٰذا جس عورت کی زندگی میں طلاق نہ آئے اُسے مہر ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حالانکہ شریعت نے مہر کا تعلق نکاح سے قائم کر رکھا ہے اور جس عورت کا نکاح ہو جائے وہ مہر کی حقدار ہو جاتی ہے۔ حضورؐ کے فرامین کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ مہر ایک قسم کا قرض ہے جو مرد نے عورت کو لازماً ادا کرنا ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص اس قرض کو ادا کیے بغیر دنیا سے چلا گیا تو اس کی حیثیت یہی ہو گی کہ وہ مقروض مر گیا۔

مہر کے بارے میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی ملکیت بن جاتا ہے اور پھر مرد اسے عورت سے لے نہیں سکتا۔ ہاں اگر کوئی عورت اپنی دلی خوشی سے شوہر کو مہر یا مہر کا کوئی حصّہ معاف کر دے تو اس کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ وہ واقعی دلی خوشی سے معاف کر رہی ہو، اُسے ایسا کرنے پر مجبور نہ کیا جا رہا ہو:

فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓـئًـا مَّرِیۡٓـئًـا ۝ (النساء: ۴)

"البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصّہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔"

۳۔ حُسنِ سلوک

بیوی کا تیسرا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آیا جائے اور بد خُلقی اور

بد سلوکی سے کام لے کر گھر کی جنت کو جہنم نہ بنایا جائے۔ حجۃ الوداع کے مشہور خطبے میں جہاں حضورؐ نے مسلمانوں کو اور بہت قیمتی نصیحتیں فرمائیں وہاں عورتوں کے بارے میں بھی تلقین کی کہ :

"عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی نصیحت قبول کرو۔" (ترمذی)

اس معاملے میں بھی ہمارے لئے بہترین نمونہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طرزِ عمل ہی ہے۔ آپؐ امہات المومنینؓ کے لئے انتہائی مہربان اور شفیق تھے اور اہلِ خانہ سے ہمیشہ دلداری اور دلجوئی کا سلوک روا رکھتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومنوں میں سب سے کامل ایمان والا وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو اور تم میں سب سے زیادہ اچھے وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لئے اچھے ہیں۔ (ترمذی)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے سب سے اچھا ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم میں سب سے زیادہ اچھا ہوں۔ (ترمذی)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے مثالی محبت تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے جتنا رشک حضرت خدیجہؓ پر آتا اتنا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی اور بیوی پر نہ آتا، حالانکہ حضرت خدیجہؓ حضورؐ کے میرے ساتھ شادی کرنے سے پہلے وفات پا چکی تھیں۔ رشک مجھے اس وجہ سے آتا کہ میں حضورؐ کو اُن کا ذکر کرتے سُنا کرتی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حکم دیا تھا کہ وہ حضرت خدیجہؓ کو خوش خبری دے دیں کہ اُنہیں (جنت میں) ایک موتی کا محل ملے گا اور (حضرت خدیجہؓ کا حضورؐ کو اتنا خیال رہتا تھا کہ) اگر آپؐ بکری ذبح کرتے تو اس میں سے اُن کی سہیلیوں کو بقدرِ کفایت ہدیہ بھیجا کرتے۔ (بخاری)

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ (اگلی) امت میں سب سے بہتر مریم بنت عمران ہیں اور (اس) اُمت میں

سب سے بہتر خدیجہ رضؓ ہیں۔ (بخاری)

ایسے ہی حضرت عائشہ رضؓ سے بھی آپؐ کو بے انتہا محبت تھی۔

حضرت انس رضؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ یارسولؐ اللہ! آپ کو لوگوں میں سے سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ — آپؐ نے فرمایا کہ عائشہ رضؓ۔ پوچھا گیا کہ مردوں میں (کون سب سے زیادہ محبوب ہے) تو فرمایا کہ اس کا باپ (یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضؓ) (ترمذی)

حضرت عائشہؓ خود بیان فرماتی ہیں کہ ایک دن حضورؐ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا کہ عائشہؓ، یہ جبریلؑ ہیں اور وہ تمہیں سلام کہہ رہے ہیں۔ حضرت عائشہ رضؓ بتاتی ہیں کہ (حضورؐ کی یہ بات سن کر) میں نے (جبریلؑ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے) کہا کہ اُن پر بھی سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت ہو اور اس کی برکتیں ہوں (یارسولؐ اللہ) آپؐ وہ کچھ دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھتے۔ (ترمذی)

عربوں کے ہاں ایک کھانے کا رواج تھا جسے "ثرید" کہتے تھے اور یہ کھانا اُن کے ہاں بہت پسندیدہ تھا۔ حضرت انس رضؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عائشہ رضؓ کو عورتوں پر ایسے ہی فضیلت حاصل ہے جیسے ثرید کو باقی کھانوں پر — (ترمذی)

سورۃ النساء آیت ۱۹ میں مردوں کو عورتوں کے بارے میں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○

"ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو اور اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔"

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے:

"یعنی اگر عورت خوبصورت نہ ہو یا اُس میں کوئی اور ایسا نقص ہو جس کی بنا پر وہ

شوہر کو پسند نہ آئے تو یہ مناسب نہیں ہے کہ شوہر فوراً دل برداشتہ ہو کر اسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے۔ حتیٰ الامکان اسے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت خوبصورت نہیں ہوتی مگر اس میں بعض دوسری خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو ازدواجی زندگی میں حسنِ صورت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر اسے اپنی اُن خوبیوں کے اظہار کا موقع ملے تو وہی شوہر جو ابتداءً محض اس کی صورت کی خرابی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا اس کے حسنِ سیرت پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات ازدواجی زندگی کی ابتداء میں عورت کی بعض باتیں شوہر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں اور وہ اس سے بددل ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ صبر سے کام لے اور عورت کے تمام امکانات کو بروئے کار آنے کا موقع دے تو اس پر خود ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کی بیوی برائیوں سے بڑھ کر خوبیاں رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ انسان ازدواجی تعلق کو منقطع کرنے میں جلد بازی سے کام لے۔" (تفہیم القرآن، جلد اول)

یہی بات حضورؐ کی ایک حدیث میں بھی واضح فرمائی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن مرد مومن عورت کو دشمن نہ رکھے، کیونکہ اگر اس کی ایک عادت ناپسندیدہ ہو گی تو دوسری پسندیدہ ہو گی یا حضورؐ نے اس کے علاوہ کچھ اور فرمایا۔ (مسلم)

ان ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ خاوندوں کو اگر بیویوں میں بعض نقائص نظر آئیں تو بھی اُن سے تعلقات توڑنے یا بدسلوکی کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں بلکہ اُن کی خوبیوں کی طرف نگاہ کریں اور حسنِ سلوک کرتے ہوئے عمدہ طریقے سے اُن کے ساتھ نباہ کریں۔

عرب سخت مزاج لوگ تھے اور اُن کے ہاں بیویوں کو مارنے کا رواج تھا۔ حضورؐ نے اس پر بھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ بخاری، مسلم اور ابوداؤد میں ایسی احادیث بیان ہوئی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ حضورؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ اپنی بیویوں کو غلاموں، کنیزوں اور جانوروں کی طرح کیوں مارتے ہو، اور ایک دفعہ جب بہت سی عورتیں اپنے خاوندوں کی مار پیٹ کی شکایت لے کر امہات المومنینؓ کے پاس آئیں تو حضورؐ نے لوگوں

کو مخاطب کر کے فرمایا اور تنبیہہ کی کہ تم میں سے جن لوگوں نے یہ کام کیا ہے وہ اچھے لوگ نہیں۔

حسنِ سلوک کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ بیوی کو توجہ اور وقت دیا جائے۔ بعض صحابہؓ عبادت و ریاضت کا اتنا شوق رکھتے تھے کہ بیویوں کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ اس پر حضورؐ نے انہیں اعتدال کی تلقین فرماتے ہوئے سمجھایا کہ تمہاری بیویوں کا بھی تم پر حق ہے یعنی وہ اس بات کی حقدار ہیں کہ انہیں توجہ اور وقت دیا جائے۔

عورت فطرتاً اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے بہت محبت رکھتی ہے اس لئے جب اس کے ان رشتے داروں کو بُرا کہا جائے تو یہ شے اس کے لئے نہایت درجہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ اس لئے ایک مومن شوہر کو اس بات کا دھیان رکھنا چاہیئے کہ وہ بیوی کے رشتے داروں کو بُرا کہہ کر اُسے اذیت نہ دے۔

بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی وہ تمام شکلیں جو از روئے شریعت درست ہیں۔ اُن میں حضورؐ نے اُمّت کے لئے نہایت روشن نمونے چھوڑے ہیں، جس میں نرمی ہے، مہربانی ہے، ہمدردی ہے، ناز برداری ہے اور سچی محبّت ہے۔

حضرت عائشہؓ کی شادی کم عمری میں ہوئی تھی، وہ بیان کرتی ہیں کہ:

(شادی کے بعد) حضورؐ کے پاس (آجانے کے بعد بھی) میں گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی اور میری کچھ سہیلیاں تھیں جو میرے ساتھ کھیلا کرتی تھیں، تو جب حضورؐ (گھر میں) تشریف لاتے تو وہ (کھیل چھوڑ کر) چھپ جاتیں تو حضورؐ انہیں میرے پاس بھیج دیتے (تاکہ میں ان کے ساتھ کھیلوں) پس وہ (پھر) میرے ساتھ کھیلنے لگتیں۔ (بخاری، مسلم)

سنن ابی داؤد میں حضرت عائشہؓ کی ایک روایت بیان ہوئی ہے کہ کسی سفر کے دوران رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہؓ کا دوڑ میں مقابلہ ہوا تو حضرت عائشہؓ جیت گئیں۔ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد جب حضرت عائشہؓ کا جسم نسبتاً بھاری ہو گیا تو ایک دفعہ پھر حضورؐ اور حضرت عائشہؓ کا مقابلہ ہوا۔ اس دفعہ حضورؐ جیت گئے اور فرمایا کہ یہ تمہاری اُس جیت کا جواب ہے۔

ایسے ہی حضرت عائشہؓ نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ایک اور واقعہ بیان فرمایا ہے کہ

کچھ حبشی مسجد میں نیزہ بازی کا کھیل دکھا رہے تھے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم مجھے وہ کھیل دکھانے کے لئے میرے لئے اپنی چادر کا پردہ کر کے حجرے کے دروازے پر کھڑے ہو گئے (جو مسجد میں کھلتا تھا) اور میں آپؐ کے کندھے اور کان کے درمیان سے اُن کا کھیل دیکھتی رہی۔ آپؐ میری وجہ سے مسلسل کھڑے رہے، یہاں تک کہ (میرا دل بھر گیا اور) میں خود ہی لوٹ آئی۔

حضورؐ کی اندرونِ خانہ زندگی کے واقعات پڑھیں تو ایک ایسے مہربان، ہمدرد اور شفیق شوہر کی تصویر نظر آتی ہے جو ایک مثالی رفیقِ حیات اور غمگسار ہمسفر ہے۔ ابنِ ماجہ میں حضورؐ کا ایک قول بیان ہوا ہے کہ ایک مسلمان شخص کا ہر کھیل باطل ہے سوائے (تین کھیلوں کے، ایک) اس کا اپنی کمان سے تیر اندازی کرنا (دوسرے) اس کا اپنے گھوڑے کی تادیب کرنا اور (تیسرے) اس کا اپنی بیوی سے کھیلنا۔

تیر کمان اور گھوڑے اس زمانے میں جنگ میں کام آتے تھے۔ اس حدیثِ پاک سے جو مفہوم نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک سچّا مومن ایک طرف تو جہاد فی سبیل اللہ میں دلچسپی رکھتا ہے اور دوسری طرف اپنی بیوی کے لئے ایک خوش طبع، خوشگوار رفیقِ حیات ثابت ہوتا ہے۔

۴۔ عدل

عورت کا چوتھا حق یہ ہے کہ اس کے معاملے میں عدل و انصاف سے کام لیا جائے۔

عورت کے ساتھ بے انصافی کرنے کی کئی شکلیں ہیں مگر ان میں شدید ترین غالباً یہی ہے کہ اگر ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو ان میں سے کسی ایک کی طرف بہت زیادہ توجہ ہو اور دوسری کو نظر انداز کیا جائے، گویا اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اسلام میں اس معاملے میں شدید تنبیہہ آئی ہے اور سختی سے حکم دیا گیا ہے کہ سب بیویوں سے یکساں سلوک کیا جائے۔ کفالت کا مسئلہ ہو یا حفاظت کا، یا پاس رہنے کا، یا کسی اور امر کا جس کا ازدواجی زندگی سے تعلق ہو، سب کے بارے میں یہی ہدایت دی گئی ہے کہ سب بیویوں کو ایک درجے پر رکھا جائے۔ البتہ دل پر چونکہ انسان کو اختیار حاصل نہیں ہوتا اس لئے

اگر شوہر کے دل میں کسی ایک بیوی کی محبت دوسری کی نسبت زیادہ ہو تو اس میں اُسے معذور سمجھا جائے گا، تاہم یہ رخصت صرف دل کے جذبات تک کے لئے ہے۔ جہاں تک ظاہری سلوک کا تعلق ہے شوہر کے لئے لازم ہے کہ جس بیوی سے کم محبت ہے، اس سے بھی ویسا ہی سلوک کرے جیسا اس سے جس سے زیادہ ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ دونوں میں سے ایک کی طرف جُھکے (اور اس کے حقوق ادا کرے اور اس کے مقابلے میں دوسری کے حقوق ادا نہ کرے) تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا آدھا دھڑ علیحدہ ہوگا۔ (ابوداؤد)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم امہات المومنینؓ کے درمیان پورے پورے عدل سے کام لیتے تھے۔ آپؐ کا طریقہ تھا کہ باری باری ہر ام المومنین کے پاس رہتے تھے۔ پھر جب آپؐ اُس مرض میں مبتلا ہوئے جس میں پھر آپؐ دنیا سے تشریف لے گئے، تو آخری ایام آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے گھر میں گزارے، مگر اس کے لئے آپؐ نے باقی امہات المومنینؓ سے اجازت مانگی تھی جو انھوں نے دے دی تھی۔

۵۔ حقِ خُلع

شوہر اور بیوی کی باہمی علیحدگی کی دو شکلیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ شوہر بیوی کو طلاق دے دے اور دوسری یہ کہ بیوی خود مطالبہ کر کے اور شوہر کو کچھ مال دے کر اپنا نکاح ختم کروالے، جسے "خلع" کہا جاتا ہے۔ سورۃ البقرہ آیت ۲۲۹ میں فرمایا گیا ہے:

"اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں (یعنی شوہر اور بیوی) حدود الٰہی پر قائم نہیں رہیں گے، تو اُن دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرلے۔"

تفہیم القرآن جلد اوّل میں اس آیت کی یوں تشریح کی گئی ہے:

"شریعت کی اصطلاح میں اسے "خلع" کہتے ہیں۔ یعنی ایک عورت کا اپنے شوہر کو کچھ

دے دلا کر اس سے طلاق حاصل کرنا۔ اس معاملے میں اگر عورت اور مرد کے درمیان گھر کے گھر ہی میں کوئی معاملہ طے ہو جائے تو جو کچھ طے ہوا ہو وہی نافذ ہوگا، لیکن اگر عدالت میں معاملہ جائے تو عدالت صرف اس امر کی تحقیق کرے گی کہ آیا فی الواقع یہ عورت اس مرد سے اس حد تک متنفر ہو چکی ہے کہ اس کے ساتھ اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحقیق ہو جانے کے بعد عدالت کو اختیار ہے کہ حالات کے لحاظ سے جو فدیہ چاہے تجویز کرے اور اس فدیے کو قبول کر کے شوہر کو اُسے طلاق دینا ہوگا۔ بالعموم فقہاء نے اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ جو مال شوہر نے اُس عورت کو دیا ہو، اس کی واپسی سے بڑھ کر کوئی فدیہ اُسے دلوایا جائے۔"

مندرجہ بالا آیت کا ترجمہ اور تشریح واضح کیے دیتے ہیں کہ اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے اس درجہ متنفر ہو چکی ہو کہ وہ شوہر کے وہ حقوق ادا نہ کر سکتی ہو جو ایک مسلمان بیوی کی حیثیت سے اسے ادا کرنے چاہئیں، تو خدا نے اس کے لیے یہ راہِ نجات رکھی ہوئی ہے کہ وہ خلع کے ذریعے اس خاوند سے علیحدگی حاصل کر لے۔ مؤطا امام مالکؒ میں ایک روایت بیان ہوئی ہے کہ ایک صحابیہ حضرت حبیبہؓ بنت سہل حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور وہ اپنے شوہر ثابتؓ بن قیس سے علیحدہ ہونا چاہتی تھیں۔ حضورؐ نے حضرت ثابتؓ بن قیس کا وہ مال جو انھوں نے حضرت حبیبہؓ کو دے رکھا تھا، انہیں واپس دلا دیا اور حضرت حبیبہؓ کو خلع حاصل ہو گیا۔

۶۔ حقِ میراث

جس طرح شوہر بیوی کے ترکے میں سے حصّہ پاتا ہے اسی طرح بیوی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ شوہر کے ترکے میں سے حصّہ لے۔ اس معاملے میں شرعی اصول یہ ہے کہ متوفی شوہر صاحبِ اولاد ہو تو بیوی اس کے ترکے کے آٹھویں حصّے کی حقدار ہوگی اور اگر وہ بے اولاد وفات پا جائے تو پھر بیوی کو ترکے کا چوتھا حصّہ ملے گا۔

وَالِدَین کے حقوق

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ؕ
(بنی اسرائیل - آیت: ۲۳)

"اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اُسی کی اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔"

واضح رہے کہ "نیک سلوک" میں ادب، تعظیم، اطاعت، رضا جوئی، خدمت سب داخل ہیں۔ والدین کے اس حق کو قرآن میں ہر جگہ توحید کے حکم کے بعد بیان فرمایا گیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کے بعد بندوں کے حقوق میں سب سے مقدم حق انسان پر اُس کے والدین کا ہے۔

کلامِ پاک اور احادیثِ نبویہؐ میں والدین کے جو حقوق بیان ہوئے ہیں، اُن کی رُو سے اولاد کا فرض ہے کہ:

۱۔ ہر جائز امر میں والدین کی اطاعت کرے،
۲۔ اپنے امکان کی حد تک اُن کی مالی اور جسمانی دونوں طرح کی خدمت کرے،
۳۔ اُنہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے،
۴۔ اُن سے دلی محبت رکھے،
۵۔ اُن کے متعلقین اور احباب سے حسنِ سلوک کرے،
۶۔ اُن کے حق میں دعائے خیر کرے،
۷۔ اور اُن کی بددعا سے بچنے کی کوشش کرتی رہے، وغیرہ۔

۱- حسنِ سلوک

حضرت ابن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے خدا کے رسولؐ کونسا عمل افضل ہے ؟ آپؐ نے فرمایا کہ نماز جو اپنے وقت پر ادا کی جائے ۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد۔ آپؐ نے فرمایا کہ والدین کے ساتھ نیکی کرنا۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد۔ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا . . . . . (ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماں باپ سے نیکی کرنے والا بیٹا جب نظرِ رحمت سے اپنے ماں باپ کی طرف دیکھتا ہے تو خدا تعالیٰ (اُس کی) ہر نظر کے عوض اس کے لئے ایک مبرور حج کا ثواب لکھتا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ چاہے وہ ہر روز سو مرتبہ دیکھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں (چاہے ہر روز سو مرتبہ دیکھے) اللہ سب سے بڑا اور بہت پاکیزہ ہے۔ (مشکوٰۃ)

ویسے تو اولاد کا فرض ہے کہ پوری زندگی والدین سے حسنِ سلوک کرتے رہیں مگر جب والدین بڑھاپے کی حالت میں ہوں تو ان کی طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سورۂ بنی اسرآئیل، آیت ۲۳ اور ۲۴ میں تلقین فرمائی گئی ہے :

> "تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اُس کی اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس اُن میں سے کوئی ایک، یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ اُن سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ اُن کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت اور شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔"

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس کی ناک خاک آلود ہو! عرض کیا گیا کہ کس کی یا رسول اللہ ؟ فرمایا (اس کی) جس نے اپنے والدین کو، اُن میں سے ایک کو یا دونوں

کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر (اُن کی خدمت کر کے) جنت میں داخل نہ ہوا۔ (مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آپؐ کی بیعت کروں، ہجرت پر اور میں اپنے ماں باپ کو روتا چھوڑ آیا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تو ان کی طرف واپس لوٹ جا اور (جاکر) انہیں ہنسا جیسے کہ انہیں رُلایا تھا۔ (ابو داؤد)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور جہاد میں شریک ہونے کی اجازت طلب کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تیرے والدین زندہ ہیں۔ اُس نے عرض کیا کہ جی ہاں! آپؐ نے فرمایا کہ پھر انہیں (کی خدمت) میں (مصروف رہ کر) جہاد کر۔ (مسلم، بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ ہی سے روایت ہے کہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں اللہ سے اجر حاصل کرنے کی خواہش میں ہجرت اور جہاد پر آپؐ سے بیعت کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس نے عرض کیا کہ جی ہاں بلکہ دونوں زندہ ہیں۔ حضورؐ نے پوچھا کہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے اجر چاہتا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ جی ہاں! (اس پر) آپؐ نے فرمایا کہ تو اپنے والدین کی طرف لوٹ جا اور انھیں اچھی رفاقت دے (خدا تعالیٰ تجھے اجر عطا کر دے گا) (مسلم)

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ مشرک اور کافر والدین کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ بیان کرتی ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں میری ماں میرے پاس آئیں اور وہ مشرک تھیں۔ پس میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے (اس کے بارے میں) دریافت کیا اور عرض کیا کہ وہ (مجھ سے کچھ حاصل کرنے کی خواہش مند ہیں، تو کیا میں اپنی ماں سے سلوک کروں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں، تو اپنی ماں سے سلوک کر۔ (بخاری)

تاہم یہ ضرور ہے کہ اگر مشرک والدین شرک اور کفر کی طرف بلائیں تو اس معاملے

میں اُن کی اطاعت کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ سورۃ لقمان آیات ۱۴ اور ۱۵ میں حکم دیا گیا ہے

"ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی تاکید کی ہے۔ اُس کی ماں نے ضعف پر ضعف اُٹھا کر اُسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اُس کا دودھ چھوٹنے میں لگے (اسی لئے ہم نے اُسے نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو اُن کی بات ہرگز نہ مان! (ہاں) دنیا میں اُن کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔۔۔۔"

باقی رہے جائز امور، تو اُن میں والدین کی اطاعت بہت ضروری ہے۔

حضرت ابو بکرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہؓ کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ میں تمہیں یہ نہ بتادوں کہ بڑے بڑے گناہوں میں سے (بھی) سب سے بڑے گناہ کون سے ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ضرور یا رسول اللہؐ! آپؐ نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا (اس حدیث کے راوی) بیان کرتے ہیں کہ آپؐ تکیہ لگائے ہوئے تھے (پھر اٹھ کر) بیٹھ گئے اور فرمایا کہ جھوٹی گواہی دینا یا (فرمایا) جھوٹ بولنا۔ پھر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم یہی بات کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم نے کہا کاش کہ حضورؐ سکوت فرماتے۔ (ترمذی)

اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ والدین کی نافرمانی بہت بڑے بڑے گناہوں میں سے ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص یمن سے ہجرت کر کے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا کہ کیا یمن میں تیرا کوئی ہے؟ اس نے عرض کیا کہ میرے والدین ہیں۔ آپؐ نے پوچھا کہ کیا انھوں نے تمہیں (ہجرت کر کے یہاں آنے کی) اجازت دی تھی۔ اُس نے عرض کیا کہ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اُن کی طرف

لوٹ جا اور اُن سے اجازت مانگ، پس اگر وہ تمہیں اجازت دے دیں تو تُو جہاد کر ورنہ اُنہیں کے ساتھ نیکی کر۔ (ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! بھلا کوئی اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں! یہ کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے تو پھر وہ (دوسرا جواباً) اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور یہ کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے (تو اس طرح اس نے گویا خود ہی اپنے والدین کو گالی دی۔ نہ یہ کسی کے والدین کو گالی دیتا نہ وہ اس کے والدین کو گالی دیتے۔) (ترمذی)

۲۔ ماں کے بارے میں خصوصی ہدایات

اگرچہ ماں اور باپ دونوں ہی بچّوں کو پالنے پوسنے میں بہت تکلیف اُٹھاتے ہیں تاہم ماں کی مشقت یقیناً باپ کی مشقت سے زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اسلام میں باپ کے مقابلے میں بھی ماں کے حقوق پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

سورۃ الاحقاف آیت ۱۵ میں فرمایا گیا ہے:

"ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے، اس کی ماں نے مشقت اُٹھا کر اُسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اُٹھا کر ہی اُسے جنا اور اُس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔"

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وضاحت سے ماں کے حقوق پر زیادہ زور دیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور پوچھا کہ انسانوں میں سے میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ تیری ماں! اس نے عرض کیا کہ (ماں کے بعد) پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا کہ پھر تیری ماں! اس نے عرض کیا کہ پھر (اس کے بعد) کون؟ آپؐ نے فرمایا کہ پھر تیری ماں! اُس نے

(چوتھی دفعہ) پوچھا کہ پھر کون؟ (اب) آپؐ نے فرمایا کہ پھر تیرا باپ! (مسلم)

یہ جو حضورؐ نے تین دفعہ ماں کا نام لینے کے بعد پھر چوتھی دفعہ باپ کا نام لیا، اس سے علماء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ایسا کرنے سے حضورؐ کی مراد ماں کے حقوق پر خصوصی زور دینا تھا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک غلام کو جو کسی کی ملکیت میں ہو، دُہرا ثواب ہے (حضورؐ کے اس فرمان کی بناء پر حضرت ابوہریرہؓ کہتے تھے کہ) مجھے اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں ابوہریرہؓ کی جان ہے کہ اگر جہاد فی سبیل اللہ، حج اور ماں کے ساتھ نیکی کرنا نہ ہوتا تو میں اسی بات کو پسند کرتا کہ میں غلامی کی حالت میں وفات پاؤں ..... (مسلم)

ابوسُلامہ سلامی بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں وصیت کرتا ہوں آدمی کو اس کی ماں کے بارے میں (کہ اس سے نیک سلوک کرے)۔

میں وصیت کرتا ہوں آدمی کو اس کی ماں کے بارے میں (کہ اس سے نیک سلوک کرے)

میں وصیت کرتا ہوں آدمی کو اس کی ماں کے بارے میں (کہ اس سے نیک سلوک کرے)

(پھر فرمایا) میں وصیت کرتا ہوں آدمی کو اس کے باپ کے بارے میں (کہ اس سے نیک سلوک کرے)

میں وصیت کرتا ہوں آدمی کو اس کے مولا کے بارے میں جو اس کا قریبی ہے (کہ اس سے نیک سلوک کرے) اگرچہ اس کو اس سے ایذا پہنچے۔ (ابن ماجہ)

لفظ مولا عربی زبان میں بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: مالک، آزاد کردہ غلام، دوست، رشتہ دار، چچا، حلیف، مددگار وغیرہ۔ اس حدیث میں بھی جیسے کہ واضح ہے پہلے حضورؐ نے تین دفعہ ماں کے بارے میں تاکید فرمائی ہے پھر دوسروں کا نام لیا۔

معاویہ بن جاہمہؓ بیان کرتے ہیں کہ (ان کے والد) جاہمہؓ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم

کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے خدا کے رسولؐ! میرا ارادہ ہے کہ جہاد کروں اور میں (اس سلسلے میں) آپؐ سے مشورہ لینے کے لئے آیا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا تیری ماں ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ جی ہاں! آپؐ نے فرمایا کہ پھر اُس (کی خدمت کو) لازم پکڑ، کیونکہ جنت اس کے قدموں کے پاس ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت مُغیرہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک خدا نے تم پر حرام کر دیا ہے ماؤں کی نافرمانی کرنا اور (حقداروں کے حقوق) روکنا اور (جس شے پر حق نہ ہو اس کو) مانگنا اور لڑکیوں کو زندہ در گور کرنا اور خدا نے تمہارے لیے مکروہ سمجھا ہے قیل و قال اور سوال کی زیادتی اور مال کو ضائع کرنا۔ (بخاری)

اسلام میں رضاعت کے رشتے کو بھی بہت احترام حاصل ہے۔ رضاعت کا مطلب ہے دودھ پلانا۔ بچے کو ماں کے علاوہ اگر کسی اور عورت نے دودھ پلایا ہو تو وہ اس کی رضاعی ماں کہلائے گی اور وہ اس کے لئے تقریباً ایسے ہی محترم ہوگی جیسے حقیقی ماں۔

ابو الطفیل بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ (مقام) جعرّانہ میں گوشت تقسیم فرما رہے تھے۔ میں اس زمانے میں لڑکا ہی تھا جو اونٹ کی ہڈی اُٹھایا کرتا تھا۔ اتنے میں ایک عورت آئی، یہاں تک کہ حضورؐ کے قریب پہنچ گئی۔ حضورؐ نے (اس کی اتنی عزت افزائی کی کہ) اُس کے لئے اپنی چادر بچھا دی اور وہ اس پر بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے تو لوگوں نے بتایا کہ یہ وہ خاتون ہیں جنھوں نے حضورؐ کو دودھ پلایا تھا (یعنی حضورؐ کی رضاعی ماں) (ابوداؤد)

حضرت اویسؒ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا تھا مگر آپؒ حضورؐ کی خدمت میں نہ پہنچ سکے۔ لہٰذا صحابی بننے کے شرف سے محروم رہ گئے۔ کیونکہ آپؒ کی والدہ زندہ تھیں، اُن کی تنہائی کے خیال سے آپؒ سفر کر کے حضورؐ تک نہ آسکے۔ والدہ کی رفاقت ہی کے خیال سے آپؒ نے اُن کی زندگی میں حج بھی نہ کیا۔ اُن کی وفات کے بعد فریضۂ حج ادا کرنے کا موقع ملا۔

حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہؒ اپنی والدہ کے بڑے خدمت گزار تھے، اپنے ہاتھوں سے اُن کے بالوں میں خضاب لگاتے تھے، کنگھی کرتے تھے، چوٹی گوندھتے تھے۔ ایک مرتبہ گھر

سے نکلے تو ہاتھوں میں مہندی کا اثر تھا۔ لوگوں نے پوچھا تو فرمایا کہ ماں کے بالوں میں خضاب لگا رہا تھا۔

مشہور صوفی حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ماں کی خدمت سے بڑھ کر کسی شے سے فیض نہیں پایا۔ ایک رات والدہ صاحبہ نے مجھ سے پانی مانگا۔ میں نے کوزے میں دیکھا تو خالی تھا، پھر گھڑا دیکھا تو اس میں بھی پانی نہیں تھا۔ میں دوڑتا ہوا ندی پر گیا اور وہاں سے پانی لایا مگر اس اثنا میں والدہ صاحبہ سو چکی تھیں۔ میں پانی کا کوزہ ہاتھ میں لیے ہوئے ساری رات اس انتظار میں کھڑا رہا کہ وہ بیدار ہوں تو پانی پیش کروں۔ سخت سردی کا موسم تھا، میرا ہاتھ ٹھٹھر گیا۔ لیکن میں نے والدہ صاحبہ کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ جب وہ خواب سے بیدار ہوئیں تو مجھے اس حالت میں کھڑا دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور پھر پانی پی کر مجھے بیشمار دعائیں دیں۔ اسی دن سے میں نے دیکھا کہ میرا قلب انوارِ الٰہی سے معمور ہو گیا۔

مشہور تابعی امام ابن سیرینؒ اپنی والدہ کا بے انتہا احترام کرتے اور اُن کی خواہشات کو پورا کرنے کا بہت دھیان رکھتے تھے۔ ان کی بہن کا بیان ہے کہ اُن کی والدہ حجازی تھیں۔ اس لئے انھیں رنگین اور نفیس کپڑوں کا بہت شوق تھا۔ ابن سیرین اس شوق کا اتنا لحاظ رکھتے تھے کہ جب والدہ کے لئے کپڑا خریدتے تو کپڑے کی لطافت اور نرمی کو دیکھتے اور اس کی مضبوطی کا مطلق خیال نہ کرتے۔ عید کے لئے خود اپنے ہاتھ سے ماں کے لئے کپڑے رنگتے۔ میں نے کبھی ان کو ماں کے مقابلے میں آواز بلند کرتے نہیں سُنا۔ جب ماں سے باتیں کرتے تو اس آہستگی کے ساتھ کرتے گویا کوئی راز کی بات کہہ رہے ہیں ـــــ طبقات ابن سعد میں امام ابن سیرین کے حالات میں بیان ہوا ہے کہ جب آپ ماں سے بات کرتے تو آواز اتنی پست ہوتی تھی کہ ناواقف آدمی اُنہیں بیمار سمجھتا تھا۔

مشہور تابعی مسعرؒ بن کدام کے حالات میں بیان ہوا ہے کہ اُن کی والدہ بڑی عابدہ خاتون تھیں، وہ مسجد میں نماز پڑھتی تھیں۔ اکثر دونوں ماں بیٹے ایک ساتھ مسجد جاتے۔ مسعر ماں کے لئے نمدہ اُٹھائے ہوتے۔ مسجد پہنچ کر ماں کے لئے نمدہ بچھا دیتے جس پر کھڑی ہو کر وہ نماز پڑھتیں، مسعر علیحدہ مسجد کے اگلے حصے میں نماز میں مشغول ہو جاتے، نماز پڑھ کر ایک جگہ

بیٹھ جاتے اور حدیث کے شائقین کو، جو ان کے گرد جمع ہو چکے ہوتے، احادیث سُناتے رہتے، پھر جب ماں عبادت سے فارغ ہو جاتیں تو مسعر درس ختم کر کے ماں کا ندہ اٹھاتے اور اُن کے ساتھ گھر واپس آجاتے۔

۳۔ باپ کے بارے میں ہدایات

اگرچہ حسنِ سلوک کا خصوصی استحقاق ماں ہی کو حاصل ہے تاہم باپ کے حقوق کو بھی مؤثر الفاظ میں واضح فرمایا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بیٹا باپ کا حق ادا نہیں کر سکتا، سوائے اس کے کہ باپ کو غلام پائے اور پھر اُسے خرید کر آزاد کردے۔ (ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رب کی رضامندی باپ کی رضامندی میں ہے اور رب کا غصّہ باپ کے غصّے میں ہے۔ (ترمذی)

ترمذی ہی میں ایک اور حدیث بیان ہوئی ہے جس میں حضرت ابوالدرداءؓ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ باپ جنت کے دروازوں میں سے بہتر دروازہ ہے۔

ان احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ باپ بہت بڑا محسن ہے اولاد کے لئے اس کے احسانات کا بدلہ ادا کرنا بے انتہا مشکل ہے اور جو اولاد باپ کو خوش رکھے، اُسے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور باپ کے حقوق ادا کرکے، اس سے حسنِ سلوک کر کے انسان جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

۴۔ والدین کے حق میں دعا کرنا

والدین کے حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ اولاد اُن کے لئے دعائے خیر کرتی رہے۔

مالک بن ربیعہؓ ساعدی بیان کرتے ہیں کہ ہم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

بیٹھے تھے کہ (قبیلہ) بنو سلمہ کا ایک شخص آگیا اور اُس نے کہا کہ یا رسول اللہ! میرے ماں باپ کے وفات پا جانے کے بعد بھی کیا اُن سے نیکی کرنے کی کوئی شکل باقی رہ جاتی ہے کہ اس طرح میں اُن سے نیکی کروں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں (کیوں نہیں، والدین کے وفات پا جانے کے بعد بھی اُن سے نیکی کی جا سکتی ہے اور اس کی شکلیں یہ ہیں)

اُن کے لئے دعا کرنا،

اور اُن کے لئے بخشش مانگنا،

اور (اُن کے بعد) اُن کی وصیت یا اقرار کو پورا کرنا،

اور اُن کے تعلق سے جو رشتے ہوں، اُن کا لحاظ رکھنا اور اُن کا حق ادا کرنا،

اور اُن کے دوستوں کا اکرام و احترام کرنا۔ (ابو داؤد)

اگر کوئی شخص زندگی میں ماں باپ کا نافرمان رہا ہو اور اسی حالت میں والدین وفات پا جائیں۔ بعد میں وہ اپنے کیے پر پچھتائے تو اب بھی نا امید ہو جانے کی کوئی بات نہیں۔ صدق دل سے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور فوت شدہ والدین کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لئے زیادہ سے زیادہ دعا کرے۔

حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کے والدین یا دونوں میں سے کوئی ایک فوت ہو جاتا ہے اور (حالت یہ ہوتی ہے کہ) وہ اُن کا نافرمان ہوتا ہے (پھر اُن کے بعد اسے اپنی خطا کا احساس ہوتا ہے) تو وہ مسلسل اُن کے لئے دعائے خیر کرتا رہتا ہے اور اُن کے لئے بخشش مانگتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ اسے نیکوکار لکھ لیتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

۵۔ والدین کی بد دعا سے بچنا

والدین کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے اولاد کے لئے جو قدرتی شفقت پیدا کر دی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اولاد کے ہاتھوں تکلیف اُٹھا کر بھی والدین یہ نہیں چاہتے کہ اُن کے بچوں کو کسی سختی کا مقابلہ کرنا پڑے، اس لیے شاذ ہی کبھی ہوتا ہے کہ والدین بچوں کو بد دعا

دیں۔ لیکن اگر بچّے والدین کو اتنا ستائیں کہ وہ اُنہیں بد دعا دینے پر اُتر آئیں تو پھر یہ بددعا بہت جلد قبول ہو جاتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین دعائیں ایسی ہیں جو (ضرور) قبول ہو جاتی ہیں، اُن کے قبول ہونے میں (قطعاً) کوئی شک نہیں۔

ایک مظلوم کی دعا،

(دوسرے) مسافر کی دعا،

اور (تیسرے) باپ کی اپنے بیٹے کے لئے بددعا۔ (ترمذی)

حضرت ابوبکرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام گناہوں میں سے اللہ تعالیٰ جو گناہ چاہے معاف فرما دیتا ہے سوائے والدین کی نافرمانی (کے گناہ) کے کہ اس کی سزا خدا نافرمانی کرنے والے کی موت سے پہلے اس کی زندگی ہی میں اسے دے دیتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

۶۔ والدین کے متعلقین سے حسنِ سلوک

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ان کے متعلقین اور دوست احباب سے حسن سلوک کیا جائے۔ اوپر ایک حدیث بیان ہو چکی ہے کہ جب حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ کیا والدین کے وفات پا جانے کے بعد بھی اُن سے نیکی کی جا سکتی ہے تو حضورؐ نے اس کی جو مختلف شکلیں بتائیں اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ اُن لوگوں سے حسن سلوک کیا جائے جو والدین کے ذریعے سے رشتے دار بنے ہوں۔ ایسی ہی اور احادیث بھی ملتی ہیں، جن میں حضورؐ نے والدین کے متعلقین سے حسنِ سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

حضرت عبداللہ بن دینار، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ کے راستے میں اُنہیں ایک بدّو ملا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اسے سلام کیا اور جس گدھے پر خود سوار تھے اُس پر اُسے سوار کر دیا اور جو عمامہ سر پر باندھے ہوئے تھے اُسے دے دیا۔ ابن دینار کہتے ہیں کہ ہم نے اُن سے عرض کیا کہ اللہ آپ کے ساتھ بھلائی کرے (آپ نے اسے

اتنا کچھ کیوں دے دیا) یہ دیہاتی لوگ ہیں اور یہ تھوڑی چیز پر بھی راضی ہوجاتے ہیں۔ (اس پر) حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ اس بدّو کا باپ (میرے باپ) حضرت عمرؓ بن خطاب کا دوست تھا اور میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ بیٹا اپنے باپ کے دوستوں سے حسنِ سلوک کرے۔ (مسلم، ترمذی)

۷۔ حقِ میراث

والدین کو اولاد کے معاملے میں جو حقوق حاصل ہیں ان میں ایک حقِ میراث بھی ہے اگر کوئی بچہ والدین کی زندگی ہی میں وفات پا جائے تو اس کے وارثوں میں اس کے ماں باپ بھی ہوتے ہیں۔ وفات پانے والا شخص اگر صاحبِ اولاد ہو تو ماں باپ دونوں میں سے ہر ایک کو ورثے کا چھٹا حصّہ ملے گا۔

۸۔ ایک افسوسناک کشمکش

قرآن وحدیث کی رو سے والدین کو جو حقوق دیے گئے ہیں اُن پر نگاہ ڈال لینے کے بعد ایک اور ضروری بات پر غور کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ بہت سے گھرانے ایسے بھی ہیں جہاں والدین اور اولاد کے باہمی تعلقات میں شدید قسم کا تناؤ پیدا ہوجاتا ہے اور طرفین کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف اتنی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں اور دل ایک دوسرے سے اتنے دُور ہو جاتے ہیں کہ وہ کسی طور بھی معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے اور اس پر ہمدردانہ غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ جس گھرانے میں بھی بدقسمتی سے یہ صورتِ حالات پیدا ہو جاتی ہے وہاں والدین اور اولاد دونوں ہی کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے اور چونکہ عموماً دونوں میں سے کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا کہ بے انصافی اس کی طرف سے ہوئی ہے، اس لئے باہمی رنجشوں کا ایک لمبا سلسلہ چل پڑتا ہے جو بعض اوقات باہمی تعلقات کے انقطاع کا ذریعہ بن جاتا ہے جو بذاتِ خود ایک بہت بڑا گناہ ہے۔

اس افسوسناک صورتِ حالات کی کئی وجوہ ہوتی ہیں اور ان سب پر یہاں تبصرہ کرنا بہت مشکل ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اکثر گھروں میں ان باہمی تعلقات کی خرابی کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ والدین اولاد کو ایک خاص راستے پر چلانا چاہتے ہیں مگر اولاد کسی اور راہ کو درست سمجھتی ہے۔ لہٰذا والدین کو اولاد کے خلاف شکایات پیدا ہو جاتی ہیں اور اولاد کو والدین کے خلاف۔

اکثر گھروں میں تو اب بھی صورت یہی ہوتی ہے کہ والدین جوان اولاد کو دینی اور اخلاقی اصولوں کے پابند بنانا چاہتے ہیں مگر اولاد نہیں مانتی۔ لہٰذا اُن کے باہمی تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب ان گھروں کی بھی کمی نہیں رہی جہاں اولاد کے دلوں میں اسلام کی محبت ہوتی ہے اور وہ دینی اور اخلاقی اصولوں کی پابندی کرنا چاہتی ہے مگر دنیا پرست والدین کے دلوں میں خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ نیکی کا رویّہ اختیار کر کے ان کے بچّے دنیاوی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ لہٰذا وہ ان کے دینی اور اخلاقی اصولوں کی پابندی کی اس شدت سے مخالفت کرتے ہیں گویا ان کی اولاد کسی جرم کا ارتکاب کر رہی ہے۔

کئی ایسی نوعمر بچیاں دیکھنے میں آئیں جو شرم و حیا کا رویّہ اختیار کرنے کی خواہشمند تھیں مگر ماؤں نے ان کی شدید مخالفت کی اور انہیں بُری طرح لعنت ملامت کرنے لگیں کہ اس طرح تو تمہیں اچھے رشتے ہی نہیں ملیں گے۔ ایسے ہی بے شمار نوعمر بچّے بھی ایسے ہیں جن کی اسلام دوستی اُن کے مادّہ پرست والدین کے لئے ذریعۂ اذیت بنی ہوئی ہے۔

اب اگر ماں باپ نیکی کی طرف بلاتے ہوں اور بچّے بے راہروی اختیار کرتے ہوں تو ان بچوں کو تو انسان والدین کے حقوق بتائے اور انہیں نصیحت کرے کہ والدین کی فرمانبرداری کرو مگر جہاں بچّے راہ راست پر ہوں مگر والدین انہیں گمراہی کی طرف گھسیٹ رہے ہوں وہاں انسان کیا کرے۔

ایسے اسلام دوست بچوں کو یہی کہا جا سکتا ہے کہ جس دین سے وہ محبت رکھتے ہیں اس نے تو مشرک اور کافر والدین کے معاملے میں بھی حسنِ سلوک کی تاکید فرمائی ہے کجا یہ کہ والدین مسلمان ہوں چاہے عملی زندگی میں اس کے احکام کی مخالفت ہی کرتے ہوں۔ اسلام دوست بچوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے مادّہ پرست والدین کی زیادتیوں کو صبر اور وقار

سے برداشت کریں۔ ظاہر ہے کہ ان کے جو احکام خدا اور خدا کے رسولؐ کے احکام کے خلاف ہیں، وہ مانے نہیں جا سکتے مگر یہ بیحد ضروری ہے کہ اُن کے سامنے گستاخی کرنے سے پوری طرح پرہیز کیا جائے اور اُن کے معاملے میں زبان کو مکمل طور پر قابو میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔

مادّہ پرست والدین کی اسلام دوست اولاد کو چند باتوں کا خصوصی دھیان رکھنا چاہیئے:

ایک یہ کہ جب والدین کوئی ایسا حکم دیں جسے پورا کرنا آپ کے بس میں ہی نہ ہو یا جو خدا اور خدا کے رسولؐ کے احکام کے خلاف ہو، تو آپ وہ کام نہ کریں، مگر والدین کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کریں جسے گستاخی کہا جا سکے۔ ایک کام نہیں ہو سکتا تو نہ کیجیے مگر یہ کہنا ضروری نہیں کہ ہم تو یہ کام ہرگز نہیں کریں گے اور آپ تو ہمیں بڑی غلط باتوں کا حکم دیتے ہیں، اور آپ تو ایسے اور ایسے کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ایسے والدین کو راہِ راست دکھانے کی کوشش نہ کریں، آپ ضرور کوشش کریں کہ انہیں گناہ اور ثواب اور غلط اور صحیح کا فرق معلوم ہو، مگر والدین کے اس رتبے کو جو اسلام نے قائم کیا ہے، ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں اور ان پر تبلیغ بھی کریں تو ادب اور تمیز کے ساتھ اور ایسی زبان میں جو اُن کے رتبے کے شایانِ شان ہو۔ یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ بعض اسلام دوست بچوں کو جب والدین غلط باتوں کا حکم دیتے ہیں تو پھر وہ بھی غصّے میں آجاتے ہیں اور والدین کے ساتھ ایسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور ایسا رویہ اختیار کر لیتے ہیں جو اس دین ہی کے اصولوں کے خلاف ہوتا ہے جس کی محبت کے باعث ان کا والدین سے اختلاف ہوا تھا۔

دوسری یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ آپ کی اسلام دوستی کا یہ تقاضا ہے کہ آپ والدین کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہ ہونے دیں۔ اسلام نے والدین کی اطاعت اور خدمت دونوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ لہٰذا جب آپ دیکھیں کہ بعض امور میں ان کی اطاعت نہ کرنا ضروری ہے تو پھر حسنِ سلوک اور خدمت پر اور بھی زیادہ زور دیں۔ خدمت مالی اور جسمانی دونوں طرح سے ہوتی ہے۔ اپنے اسباب و وسائل کے لحاظ سے ان دونوں اقسام کی خدمت میں پورا زور صرف کریں تاکہ اگر والدین ایک معاملے میں آپ سے ناراض ہیں تو اس خدمت کے

باعث خوش بھی ہو جائیں۔ عجب نہیں کہ آپ کی خدمت ان کے دلوں کو نرم کر دے اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ بالآخر وہ آپ کے نظریات کے بھی حامی ہو جائیں یا کم از کم ان کی مخالفت کرنا چھوڑ دیں۔ اس لئے والدین کتنے ہی غلط احکام کیوں نہ دیں اور نظریات کے اختلاف کے باعث آپ سے کتنی ہی سختی کا سلوک کیوں نہ کریں آپ نے اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے اور ان کی خدمت کرنے کی کوشش کرتے ہی رہنا ہے اور اس میں سستی نہیں کرنی۔

تیسری ضروری بات یہ ہے کہ کبھی اس بات کو نہ بھولئے کہ دل بدلانا انسان کا نہیں خدا کا کام ہے اور اولاد ہونے کے باعث آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ اپنے والدین کے لئے دعائے خیر کرتے رہیں۔ اب دعائے خیر صرف یہی نہیں کہ آپ اُن کی آخرت کی بخشش کے لئے دعا کرتے رہیں بلکہ دعائے خیر میں یہ بھی شامل ہے کہ آپ ان کی ہدایت کے لئے دعا کرتے رہیں تاکہ وہ زندگی میں ایسا رویہ اختیار کریں جو انہیں آخرت کی کامیابی دلانے میں مددگار ہو۔

یاد رکھئے کہ آپ کے والدین کے جو بھی نظریات ہوں وہ خدا کے بعد آپ کے سب سے بڑے محسن ہیں۔ اپنے ان محسنوں کے معاملے میں ادب و احترام کے رویّے کو قائم رکھئے۔ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے میں کوئی کمی نہ کیجئے اور ان کے سچّے خیر خواہ رہیئے اور سب سے بڑی خیر خواہی یہی ہے کہ ادب اور تمیز سے انہیں راہ راست کی طرف لانے کی کوشش کرتے رہیے اور اُن کے ہدایت یافتہ ہونے اور دین و دنیا دونوں میں سرخرو ہونے کی دعا جاری رکھیے!

اولاد کے حقوق

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب اور طریقہ ہائے زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں والدین کے حقوق پر تو زور دیا گیا ہے مگر اولاد کے حقوق کو چنداں قابلِ التفات نہیں سمجھا گیا۔ حالانکہ ترتیبِ زمانی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بچّہ پہلے اپنے ضروری حقوق پورے کرواتا ہے پھر ایک مدت کے بعد جا کر وہ اس قابل ہوتا ہے کہ والدین کے حقوق پورے کر سکے۔ لہٰذا دوسرے مذاہب کے برعکس اسلام میں اولاد کے حقوق کو بڑی وضاحت سے بیان فرما دیا گیا ہے۔

۱۔ پرورش

بچّوں کا والدین پر پہلا حق تو یہی ہے کہ وہ اپنے وسائل اور امکان کی حد تک بہتر سے بہتر طریقے سے اولاد کو پالیں اور ان کی زندگی کے قیام اور اُن کے جسم کی نشو و نما کے لئے جو کچھ کرنا ضروری ہو اس سے غفلت نہ برتیں اور انہیں زندہ رہنے کے حق سے محروم نہ کریں۔

اگرچہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے دلوں میں مامتا اور شفقتِ پدری کے جذبات اس طرح ودیعت کر دیے ہیں کہ وہ خوشی سے بچوں کی خاطر تکلیف اُٹھاتے ہیں، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخِ انسانی میں متعدد دَور ایسے آئے ہیں جب قتلِ اولاد کی مذموم رسم جاری رہی ہے اور موجودہ دَور بھی اپنے علم اور تہذیب کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود اس سے خالی نہیں ہے۔ دنیا میں ایسی تہذیبیں رہی ہیں جن میں باپ کو یہ حق حاصل

تھا کہ اولاد کو قتل کر دے اور پھر اس قتل پر کوئی قانونی باز پرس بھی نہیں ہوتی تھی۔ پرانی عرب تہذیب بھی اس کی ایک مثال ہے جہاں بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا اور بیٹوں کو قربان گاہوں پر بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔

والدین اولاد کو کیوں قتل کرتے رہے ہیں، اس کی متعدد وجوہ بتائی جاتی ہیں۔ پہلی وجہ مذہبی ہے۔ مشرک اور بُت پرست قوموں میں رواج رہا ہے کہ وہ دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے بچوں کو اُن کے آستانوں پر ذبح کرتے تھے منتیں مانی جاتی تھیں کہ فلاں کام ہو گیا تو اپنے بچے کی قربانی دیں گے اور اس طرح ان معصوموں کی جانیں ظالمانہ طور پر لی جاتی تھیں۔

اسلام میں ایک طرف تو توحید پر زور دیا گیا ہے جس سے کفر، شرک اور غیر اللہ کے آگے نذریں نیازیں پیش کرتے اور ان کے آستانوں پر انسانی یا حیوانی قربانی دینے کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو اتنا مقدس قرار دے دیا ہے کہ:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ

"جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔"

(سورۃ المائدہ - آیت: ۳۲)

قتلِ اولاد کی دوسری وجہ فقر و فاقہ اور رزق کی کمی بتائی جاتی ہے۔ عرب میں غذا کا مسئلہ خاص طور پر شدید تھا۔ کیونکہ وہ علاقہ بحیثیت مجموعی کوئی زرخیز علاقہ نہیں تھا۔ اس قلت کا حل اُن کے نزدیک یہی تھا کہ اولاد خصوصاً بیٹیوں کو زندہ ہی نہ رہنے دیا جائے۔ کیونکہ وہ کھائیں گی تو بیٹوں ہی کی طرح مگر ضرورت پڑنے پر میدانِ جنگ میں جا کر لڑیں گی نہیں ـــــ اس طرح وہ احمق لوگ بزعمِ خود اپنی اولاد کے رازق بن بیٹھتے تھے۔ قرآنِ پاک نے اس جاہلانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ اولاد کے رازق اس کے والدین نہیں، بلکہ ان کا خالق ہے بلکہ خود ان رازق بن بیٹھنے والوں کا رازق بھی اُن کا خالق ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ

"اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل مت کرو،

إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا ۝

(بنی اسرآئیل : ۳۱)

ہم انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بہت بڑی خطا ہے۔"

نیز فرمایا :

وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (ھود : ٦)

"زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمّے نہ ہو۔"

لہٰذا غذا کی کمی کے خدشے سے اولاد کو قتل کرنا ظلم ہی نہیں حماقت بھی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جس تناسب سے انسانی آبادی کو بڑھاتا ہے اسی تناسب سے وسائل رزق میں بھی اضافہ کرتا جاتا ہے۔ انسان کا کام یہ نہیں کہ انسانی جانوں کو فنا کرے بلکہ یہ ہے کہ اپنے خداداد علم سے کام لے کر خدا کے پیدا کردہ وسائل رزق کا پتہ چلائے۔

قتل اولاد کی تیسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ عربوں کے ہاں آئے دن جنگ وجدال ہوتی رہتی تھی۔ ان جنگوں میں خونریزی کم اور لوٹ مار زیادہ ہوتی تھی۔ باہم لڑنے والے قبائل ایک دوسرے کے جانور اور عورتیں اٹھا کر لے جاتے تھے اور پھر ایسی صورت میں بیٹیاں اُن کے لئے ننگ وعار کا باعث بنتی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اہلِ عرب اس بات کو بھی باعثِ عار سمجھتے تھے کہ کوئی شخص اُن کا داماد بن جائے۔ یہی جاہلانہ اور ظالمانہ نظریہ ہندوستان میں راجپوتوں میں بھی پایا جاتا تھا اور وہ اس خوف کے مارے کہ کوئی شخص ان کا داماد کہلائے گا بیٹیوں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ اس احمقانہ طرزِ فکر نے خدا معلوم کتنی معصوم جانوں کو ختم کیا اور کتنے باپوں کے دلوں سے شفقتِ پدری کا قلع قمع کر کے اُنہیں قاتلین کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اسلام اس جہالت کو شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسے ایک ہولناک جرم قرار دیتا ہے۔

سورۃ التکویر، آیت ۸، ۹ میں فرمایا ہے :

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ۝

"اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی۔"

"اس آیت کے اندازِ بیان میں ایسی شدید غضبناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ سخت غضبناکی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابلِ نفرت ہوں گے کہ اُن کو مخاطب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اس معصوم کو کیوں قتل کیا، بلکہ اُن سے نگاہ پھیر کر معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ تُو بے چاری آخر کس قصور میں ماری گئی اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا اور کس طرح اُسے زندہ دفن کر دیا۔" (تفہیم القرآن، جلد ششم، صفحہ ۲٦۴)

ان تمام احکامات کی روشنی میں والدین کا پہلا فریضہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ نے انہیں اولاد کی نعمت سے نوازا ہے تو وہ ان کی پرورش کو اپنا فرضِ منصبی سمجھیں اور اپنے وسائل و امکان کی حد تک انہیں اچھی طرح پالیں پوسیں۔

۲۔ رضاعت اور کفالت

بچّے کا دوسرا حق یہ ہے کہ جب تک وہ عام غذائیں کھانے کے قابل نہ ہو جائے، ماں اسے دودھ پلائے۔ اور جب تک وہ نابالغ ہے، باپ اس کی کفالت کرے۔ اگر بچے کی ماں کسی وجہ سے اس سے علیحدہ ہو چکی ہو: مثلاً وفات پا چکی ہو یا طلاق وغیرہ کے باعث بچے سے جُدا ہو چکی ہو تو پھر بچّے کے باپ کا فرض ہے کہ اس کی رضاعت کا بندوبست کرے، چاہے وہ مطلقہ ماں ہی سے درخواست کرے کہ وہ بچے کو دودھ پلا دے یا کسی اور عورت سے دودھ پلوائے، پھر جو عورت بھی دودھ پلائے گی، اس کا کھانا کپڑا بچے کے باپ کے ذمے ہوگا۔ دودھ پلانے کی مدت قرآن کی رو سے دو سال ہے۔ دو سال کے بعد بچہ عموماً اس قابل ہو جاتا ہے کہ دوسری غذائیں کھا سکے۔ ہاں اگر والدین باہمی مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو اس کی اجازت ہے۔

بچّے کو دودھ پلا کر اس کی زندگی کو قائم رکھنا اتنا مقدس عمل ہے کہ جو عورت کسی بچّے کو دودھ پلائے، وہ اگر اس کی ماں نہ بھی ہوگی تو بھی اس کا رتبہ ماں کے قریب قریب ہو جائے گا۔ اُسے اس بچّے کی رضاعی ماں کہا جائے گا اور رضاعت کا یہ رشتہ صرف دودھ

پلانے والی تک ہی نہیں رہے گا بلکہ اس کے دوسرے رشتہ داروں تک بھی پہنچے گا۔ اس کا شوہر بچے کا رضاعی باپ ہوگا۔ اُس کی اولاد بچے کے رضاعی بہن بھائی ہوں گے۔ اس ماں باپ بچے کے رضاعی نانا نانی ہوں گے، اُس کے بہن بھائی بچے کے رضاعی خالہ ماموں ہوں گے۔ اس کے شوہر کے بہن بھائی بچے کے رضاعی چچا پھوپھی ہوں گے، وغیرہ۔ اور پھر نسب کے جن جن رشتوں میں نکاح حرام ہے رضاعت کے ان رشتوں میں بھی نکاح حرام ہوگا۔ مثلاً کسی بچے کی شادی اپنی رضاعی خالہ سے نہیں ہوسکتی، نہ کسی بچی کی شادی اپنے رضاعی ماموں یا رضاعی چچا سے ہوسکتی ہے۔ رضاعت کا رشتہ مقدس بھی ہے اور حسنِ سلوک اور عزت و احترام کا مستحق بھی ہے۔

عمر بن سائب بیان کرتے ہیں کہ مجھ تک یہ روایت پہنچی کہ ایک دن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے کہ آپؐ کے رضاعی باپ آگئے۔ آپؐ نے اُن کے لئے اپنے کپڑے کا ایک حصّہ بچھا دیا۔ وہ اس پر بیٹھ گئے۔ پھر آپؐ کی (رضاعی) ماں آگئیں تو آپؐ نے ان کے لئے اپنے کپڑے کا دوسری طرف کا آدھا حصّہ بچھا دیا۔ وہ (بھی) اس پر بیٹھ گئیں۔ پھر آپؐ کا رضاعی بھائی آگیا تو آپؐ کھڑے ہوگئے اور اُس کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ (ابوداؤد)

بچے کی رضاعت کا بندوبست کرنے کے علاوہ یہ بھی باپ ہی کا فرض ہے کہ بچے کی کفالت کرے۔ اگر باپ نہ ہوگا تو درجہ بدرجہ دوسرے ورثاء پر یہ فریضہ عائد ہوتا جائے گا اور بچپن کے دوران بچے کا یہ حق قائم رہے گا کہ ذمہ دار لوگ اس کی ضروریاتِ زندگی کا بوجھ اُٹھائے رہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جو باپ اپنے نابالغ بچوں کی کفالت کرنے سے جان بچاتے ہیں وہ کتنی بڑی خطا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ بیویوں سے تعلقات خراب ہوگئے تو نہ صرف بیویوں کا خرچ روک لیا گیا بلکہ ساتھ ساتھ بچوں کا خرچ بھی بند کردیا گیا۔

۳۔ عدل

والدین پر بچے کا ایک حق یہ بھی ہے کہ وہ اس کے ساتھ انصاف کریں۔ بچوں کے ساتھ

بے انصافی کرنے کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ کبھی اولاد ایک سے زیادہ ماؤں سے ہوتی ہے تو باپ کا میلان جس بیوی کی طرف زیادہ ہوتا ہے وہ اس کے بچوں کا زیادہ دھیان رکھتا ہے اور دوسرے بچوں کو نظرانداز کرتا ہے۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ ایک بیوی وفات پا گئی یا اُسے طلاق دے دی گئی اور دوسری شادی کی گئی۔ اب جن بچوں کی ماں موجود نہیں اُن سے توتوجہ ہٹ گئی اور ان کے حقوق ادا کرنے سے کوتاہی برتی جانے لگی اور جن بچوں کی ماں موجود ہے اُن سے حسنِ سلوک ہوتا رہا۔ ایسی صورتِ حالات میں عموماً باپوں کو پہلی بیویوں کے بچوں میں خرابیاں بھی نظر آنی شروع ہوجاتی ہیں اور وہ اپنی بدسلوکی کو جائز سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ شرارت تو وہ بچے بھی کرتے ہیں جن کی ماں موجود ہے اور وہ بھی کرتے ہیں جن کی ماں موجود نہیں ہوتی۔ مگر ماں والے بچوں کی ماں ان کی شرارتوں پر پردہ ڈال لیتی ہے مگر جن کی ماں موجود نہیں ہوتی اُن کی شرارتیں نمایاں ہوجاتی ہیں اور باپ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ پہلے بچے زیادہ شریر ہیں اور دوسرے مطیع اور با اخلاق ہیں۔ ایسے ہی بعض گھرانوں میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان بہت فرق کیا جاتا ہے اور لڑکے کے حقوق تو خوشی خوشی ادا کیئے جاتے ہیں اور لڑکیوں کو بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ اب جس شکل میں بھی .... بے انصافی کی جائے خدا اور خدا کے رسولؐ کے نزدیک یہ فعل سخت ناپسندیدہ ہے۔

حضرت نعمانؓ بن بشیرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (اے لوگو!) اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔ (اے لوگو!) اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔ (نسائی)

اس سلسلے میں حضرت نعمانؓ بن بشیرؓ ہی سے ایک اور روایت بیان ہوئی ہے۔ حضرت نعمانؓ بتاتے ہیں کہ میرے باپ (حضرت بشیرؓ) نے اپنے مال میں سے کچھ حصہ میرے نام ہبہ کیا۔ اس پر میری ماں عمرہؓ بنت رواحہ نے کہا کہ میں اس پر راضی نہیں جب تک کہ آپ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ہبہ پر گواہ نہ بنائیں۔ میرے والد حضورؐ کی خدمت میں چل پڑے تاکہ آپؐ کو اس ہبہ پر گواہ بنائیں جو انھوں نے میرے نام کیا تھا۔ حضورؐ نے اُن سے پوچھا کہ کیا تم نے اپنی ساری اولاد کو اسی طرح دیا ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ نہیں۔

اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ خدا سے ڈرو اور اپنی اولاد میں انصاف کرو۔ پس میرے والد لوٹ آئے اور اپنا ہبہ واپس لے لیا۔ (مسلم)

مسلم ہی کی ایک اور روایت میں یہی واقعہ بیان ہوا ہے اور اُس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اے بشیرؓ! کیا اس کے علاوہ تیرے اور بھی لڑکے ہیں۔ انھوں نے عرض کیا کہ جی ہاں! حضورؐ نے فرمایا کہ کیا ان سب کو اتنا ہی ہبہ کیا ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ نہیں۔ (اس پر) آپؐ نے فرمایا، تو پھر مجھے گواہ نہ بناؤ کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔

بچوں کے درمیان انصاف نہ کرنے کا ایک بڑا نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ بچوں کے درمیان بے اتفاقی پیدا ہو جاتی ہے اور دوسرے پھر جن بچوں سے بے انصافی کی جاتی ہے وہ والدین کو وہ محبت اور احترام نہیں دے سکتے جو اولاد کو دینا چاہیئے۔ اس طرح بے انصافی سے کام لے کر والدین ایک طرف تو خدا تعالیٰ کے حضور میں گنہ گار ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر سب بچوں کے حقوق ادا کرنے لازم کیے تھے مگر وہ ان میں سے کچھ بچوں کے حقوق ادا کرتے ہیں اور کچھ کے نہیں کرتے اور دوسری طرف وہ دنیاوی لحاظ سے بھی نقصان اُٹھاتے ہیں کیونکہ بسا اوقات وہ اُن بچوں کے حسنِ سلوک اور خدمت سے محروم ہو جاتے ہیں جن سے انھوں نے بے انصافی روا رکھی ہوتی ہے اور پھر معاشرہ بھی انہیں "ظالم" ہی کا خطاب دیتا ہے۔ لہٰذا والدین کی دینداری ہی نہیں عقلمندی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھیں۔ ہاں البتہ اگر کوئی بچّہ ماں باپ کی اطاعت و خدمت اوروں سے زیادہ کرتا ہے تو اُسے کچھ زیادہ دے دینے میں حرج نہیں۔

۴۔ تعلیم و تربیت

بچّے کا ایک حق یہ بھی ہے کہ والدین صرف اُسے پال کر جوان ہی نہ کر دیں بلکہ اُسے عمدہ تعلیم و تربیت بھی دیں۔ تعلیم و تربیت سے مراد یہ ہے کہ اُسے دین کے احکام کا علم سکھائیں اور اُسے اُن احکام پر عمل کرنے کی عادت ڈالنے کی کوشش کرتے رہیں۔

بچّے کی تعلیم وتربیت کو کتنی اہمیت دی گئی ہے وہ اسی سے ظاہر ہے کہ پہلی آواز جو بچّے کے کان میں ڈالی جاتی ہے وہ اذان ہے۔ شرعی رسوم میں یہ ایک اہم رسم ہے کہ جب بچّہ پیدا ہو تو اس کو کچھ پلانے یا چٹانے سے پہلے اس کے کان میں اذان پڑھی جائے۔ سورۂ مریم آیت ۵۵ میں حضرت اسمٰعیلؑ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اُن کا ایک وصف یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ:

كَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۪ "وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتے تھے۔"

سورہ طٰہٰ آیت ۱۳۲ میں حضورؐ کو تلقین فرمائی گئی ہے کہ:

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ "اور اپنے اہل وعیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو۔"

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بچوں کی زبان سے سب سے پہلے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہلواؤ اور موت کے وقت انہیں اسی کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تلقین کرو۔ (بیہقی)

حضرت سعیدؓ بن العاص بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی باپ نے بیٹے کو حسنِ ادب سے بہتر تحفہ نہیں دیا۔ (ترمذی)

مراد یہ ہے کہ باپ کی طرف سے اولاد کے لئے سب سے عمدہ تحفہ یہی ہے کہ وہ اُن کی اتنی اچھی تربیت کرے تاکہ وہ شائستگی اور اچھے اخلاق وسیرت کے حامل ہوں۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی اولاد کا اکرام کرو اور انہیں حسنِ ادب سے آراستہ کرو۔ (سنن ابن ماجہ)

اولاد کا اکرام کرنا یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور امانت سمجھ کر اُن کی قدر کی جائے۔ حسبِ استطاعت اُن کی ضروریاتِ زندگی کا بندوبست کیا جائے اور اُنہیں بوجھ نہ سمجھا جائے۔

اگرچہ انسان شرعی احکام کا مکلّف بالغ ہونے پر ہی ہوتا ہے تاہم حضورؐ نے حکم

دیا ہے کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اُسے نماز کی تلقین کرنا شروع کر دیا جائے اور دس سال کا بچہ اگر نماز نہ پڑھے تو اُسے اس پر سزا دی جائے۔ یہ اسی لئے ہے کہ بچے کو نماز کی عادت ہو جائے اور بالغ ہونے تک وہ پکّا نمازی بن جائے۔

شیخ سعدیؒ سے پوچھا گیا کہ اولاد کی تربیت کیسے کرنی چاہیئے۔ انھوں نے فرمایا:

۱۔ جب بچّے کی عمر دس سال سے زیادہ ہو جائے تو اسے نامحرموں اور ایروں غیروں میں نہ بیٹھنے دو۔

۲۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا نام باقی رہے تو اولاد کو اچھے اخلاق کی تعلیم دو۔

۳۔ اگر تمہیں بچّے سے محبت ہے تو اُس سے زیادہ لاڈ پیار نہ کرو۔

۴۔ بچّے کو استاد کا ادب سکھاؤ اور اُسے اُستاد کی سختی سہنے کی عادت ڈالو۔

۵۔ بچے کی تمام ضرورتیں خود پوری کرو اور اُسے ایسے عمدہ طریقے سے رکھو کہ وہ دوسروں کی طرف نہ دیکھے۔

۶۔ شروع شروع میں پڑھاتے وقت بچّے کی تعریف کرکے اور اُسے شاباش دے کر اس کی حوصلہ افزائی کرو۔ جب وہ اس طرف راغب ہو جائے تو اسے اچھے اور بُرے کی تمیز سکھانے کی کوشش کرو اور ضرورت پڑے تو سختی بھی کرو۔

۷۔ بچے کو دستکاری (ہُنر) سکھاؤ، اگر وہ ہنر مند ہوگا تو بُرے دنوں میں بھی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے بجائے اپنے ہُنر سے کام لے سکے گا۔

۸۔ بچوں پر کڑی نگرانی رکھو تاکہ وہ بُروں کی صحبت میں نہ بیٹھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ماں باپ کا فریضہ صرف بچّے کو پال دینا ہی نہیں، بلکہ اُسے اس طرح پالنا ہے کہ وہ بہتر سے بہتر زندگی گزارے اور آخرت میں زیادہ سے زیادہ بہتری حاصل کر سکے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بہت سے والدین کی ساری توجہ صرف بچّے کی مادّی بہتری ہی کی طرف لگی رہتی ہے۔ حالانکہ ہر ذی روح نے ایک دن اس مادّی دنیا سے رخصت ہو کر اس دائمی زندگی کو اختیار کرنا ہے جس کا کوئی دوسرا کنارہ نہیں۔ اگر بچّے کو اسی کے لئے تیار نہ کیا گیا تو پھر اس سے بڑی غفلت اور بچّے کے حق میں دشمنی اور کیا ہوگی۔ بچّے کو

عمدہ لباس پہنانے، عمدہ کھانے کھلانے، اعلیٰ قسم کے اسکول یا کالج میں داخل کرانے سے زیادہ اس بات کی فکر ہونی چاہیئے کہ اس کی تربیت عمدہ ہو۔

تربیت کی فکر بالکل ابتدا ہی سے ہونی چاہیئے۔ بچپن میں بچے عموماً کہانیاں سننے کے شوقین ہوتے ہیں۔ اگر مائیں ان کے اس شوق سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں تو بالکل ابتدائی عمر ہی میں بچے کے ذہن میں نیکی کے وہ بیج بوئے جا سکتے ہیں جن کا پھل بچہ انشاء اللہ زندگی میں بھی کھاتا رہے گا اور بعد از موت بھی۔ ماں باپ کو تربیت کا حق ضرور ادا کرنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی بچہ اپنی فطرت کے لحاظ سے ایسا ہو کہ تربیت کے باوجود وہ.... بے راہرو ہی نکلے، لیکن اگر والدین اس کی اصلاح کی کوشش کرتے رہے ہیں تو انہیں اتنی تسلّی تو رہے گی کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کیا تھا اور خدا کے نزدیک بھی وہ بری الذّمہ ہوں گے۔ پھر اس معاملے کا ایک رُخ اور بھی ہے وہ یہ کہ بعض اوقات والدین کی کوششیں فوری طور پر اثر نہیں دکھاتیں مگر کچھ مدت گزرنے پر بچے کی زندگی میں کوئی ایسا موڑ آجاتا ہے کہ مدتوں پہلے کی سُنی ہوئی باتیں اپنا اثر دکھانے لگتی ہیں اور بچہ نیکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے والدین حد درجہ نیک تھے اور انہوں نے بیٹے کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی مگر حضرت عبداللہ پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اتنے نیکوکار اور سمجھانے بجھانے والے والدین کے فرزند ہونے کے باوجود آپ کھیل کود میں مست رہتے۔ ہر کام میں لاپروائی برتتے، ہر وقت برائیوں میں پھنسے رہتے، گانا بجانا اور عیش اڑانا یہی دن رات کا مشغلہ تھا، یہاں تک کہ پینا پلانا بھی شروع ہو گیا، رات رات بھر دوستوں کی محفلیں جمی رہتیں، ساز بجتا، گانا ہوتا اور شراب کا دَور چلتا۔ یہ گھناؤنی زندگی دیکھ کر والدین کا بُرا حال تھا، اندر ہی اندر کڑھتے، روتے اور زاری کرتے، نذریں مانتے، صدقہ دیتے، اللہ تعالیٰ کے حضور میں بیٹے کی اصلاح کے لئے دعائیں کرتے۔ انھوں نے بیٹے کی تربیت میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی مگر بظاہر اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا تھا۔

آخر وہ وقت آہی گیا جب خدا تعالیٰ نے اس صالح جوڑے کی التجاؤں کو سُن لیا۔ ایک رات جب عیش و نشاط کی محفل خوب گرم تھی اور شراب کے دَور چل رہے تھے کہ حضرت عبداللہ کی

آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک لمبا چوڑا خوبصورت باغ ہے اور ایک ٹہنی پہ ایک پیاری سی چڑیا بیٹھی اپنی سریلی اور میٹھی آواز میں یہ آیت پڑھ رہی ہے :

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ (الحدید : ۱۶)

”کیا ایمان لانے والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اُس کے نازل کردہ حق کے آگے جُھکیں۔“

حضرت عبداللہ گھبرائے ہوئے اُٹھے اور اُن کی زبان پر یہی بول جاری تھے۔ ”خدایا! وہ وقت آگیا، پیارے خدا، وہ وقت آگیا۔!“

پھر اُٹھے، شراب کی بوتلیں پٹک دیں، چنگ و ستار چور کر دیے، رنگین کپڑے پھاڑ ڈالے اور غسل کر کے سچے دل سے توبہ کی۔

پھر یہی عبداللہ بن مبارک تھے جو علم و عمل کے آسمان پر سورج بن کر چمکے اور آپ کی روشنی نے ایک عالم کو منور کیا۔ آپ کی نیکی، بزرگی اور فضیلت کا اندازہ لگانے کے لئے ایک اجتماع کا حال بیان کرنا کافی ہوگا، جو آپؒ کے زمانے میں ہوا۔ وقت کے بڑے بڑے علماء یہ فیصلہ کرنے کے لئے ایک جگہ جمع ہوئے کہ اس زمانے کا سب سے بڑا عالم اور سب سے بڑا بزرگ کون ہے۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ قرآن و حدیث کے علم، فقہ، ادب، شاعری، نحو، لغت، تقریر، عبادت، راتوں کو جاگنا، بیکار باتوں سے بچنا، لوگوں سے اچھا سلوک کرنا، لڑائی جھگڑے سے بچنا، ہمیشہ انصاف پر قائم رہنا، گھوڑے کی سواری، ہتھیار باندھنا، حج کرنا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ ان سب خوبیوں میں حضرت عبداللہ سب سے بڑھ کر ہیں، چنانچہ سب نے مل کر انہیں اپنا سردار مان لیا اور انہیں اپنے لئے ہر بھلائی میں نمونہ قرار دیا۔

حضرت عبداللہ کی زندگی اُن والدین کے لئے بہت باعثِ تسکین ہونی چاہیئے جو بچوں کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں اور پھر جب دیکھتے ہیں کہ اثر نہیں ہوتا تو غم و اندوہ کا شکار رہتے ہیں۔ اس مبارک زندگی میں ان کے لئے یہ سبق ہے کہ وہ عبداللہ بن مبارکؒ کے والدین کی طرح کوشش، تڑپ اور دعا و التجا کو جاری رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ایک دن ان کی ضرور سُنے گا۔

وہی عبداللہ بن مبارکؒ جو کبھی صبح و شام عیش و نشاط اور لہو و لعب میں چور رہتے تھے، آخر

اس بلند مقام پر پہنچے کہ مشہور محدث اور زاہد امام ذہبیؒ نے آپ کے بارے میں فرمایا:

"حضرت عبداللہ میں کونسی خوبی نہیں ہے۔ خدا ترسی، عبادت، خلوص، جہاد، زبردست علم، دین میں مضبوطی، حسن سلوک، بہادری، خدا کی قسم مجھے اُن سے محبت ہے اور اُن کی محبت سے مجھے بھلائی کی اُمید ہے۔"

حضرت عبداللہ زندگی اس طرح گزارتے تھے کہ سال کو تین حصّوں میں تقسیم کر رکھا تھا، چار مہینے حدیث پڑھنے پڑھانے میں گزارتے، چار مہینے جہاد میں رہتے اور چار مہینے حج کے سفر میں رہتے۔ حضرت سفیان ثوریؒ کہا کرتے تھے کہ میں نے بہت کوشش کی کہ کم از کم ایک سال ہی حضرت عبداللہ کی طرح زندگی گزار لوں مگر کبھی کامیاب نہ ہوا۔

بچے کی عمدہ تربیت کر کے اور اُسے نیکی کی راہ پر چلا کر والدین خود بھی نفع میں رہتے ہیں۔ کیونکہ نیک اولاد والدین کے لئے زندگی میں آنکھ کی ٹھنڈک اور موت کے بعد بخشش کا سبب بنتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل ختم ہو جاتے ہیں مگر تین عمل (ایسے ہیں جو اس کی موت کے بعد بھی جاری رہتے ہیں): (ایک) صدقہ جاریہ (دوسرے) وہ علم جس سے لوگ نفع حاصل کریں، اور (تیسرے) نیک اولاد، جو اس کے لئے دعا کرے۔ (ترمذی)

حضرت سعید بن مُسیّب فرمایا کرتے تھے کہ آدمی کے مرنے کے بعد اُس کے بیٹے کے دعا کرنے سے اُس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ (موطّا)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی کا درجہ جنت میں بلند کیا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرا درجہ کیسے بلند ہو گیا۔ (حالانکہ اب زندگی ختم ہو چکی ہے اور عمل کا موقع بھی ختم ہو چکا ہے) تو اسے بتایا جاتا ہے کہ (تیرے بعد) تیرے بیٹے نے جو تیرے لئے استغفار کی اس کے باعث (تیرا درجہ بلند ہو گیا ہے) (ابن ماجہ)

بچّے کی تربیت کے سلسلے میں ایک بات جو والدین کو یاد رکھنا لازمی ہے وہ یہ ہے کہ بچّے کو اچھا بنانے کے لئے والدین کا خود اچھا بننا بہت ضروری ہے، ورنہ ان کے سمجھانے

بجھانے کا بہت کم اثر ہوگا اور عجب نہیں بالکل ہی اثر نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو انسان کی اس بات میں اثر نہیں ہوتا جس پر وہ خود عمل نہ کرتا ہو۔ اور دوسرے جب بچے دیکھیں گے کہ ماں باپ انہیں جن کاموں کا حکم دے رہے ہیں اُن پر خود عمل نہیں کرتے تو وہ ان کی نصیحتوں پر عمل کرنے کو بالکل غیر ضروری شمار کریں گے۔

ذیل میں کچھ دلچسپ واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن سے پتہ چلے گا کہ ذمہ دار اور فرض شناس والدین کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا کس درجہ دھیان رہتا تھا۔

مشہور تابعی حضرت ربیعہؒ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش سے کچھ ماہ پہلے ان کے والد فروخ جہاد پر چلے گئے۔ جاتے ہوئے انھوں نے اپنی بیوی کو تیس ہزار اشرفیاں دیں اور پھر حالات کچھ ایسے ہوئے کہ وہ ستائیس برس تک وطن واپس نہ آسکے۔ اس دوران میں ربیعہؒ کی والدہ نے شوہر کا چھوڑا ہوا اثاثہ بیٹے کی تعلیم و تربیت پر صرف کر دیا اور جب فروخ واپس آئے تو ربیعہ چھبیس برس کے ہو چکے تھے اور اُن کے علم و فضل کی شہرت دُور دُور تک پہنچ چکی تھی۔ واپسی پر فروخ نے بیوی سے اس رقم کے بارے میں پوچھا، جو وہ جاتے وقت انہیں دے گئے تھے، تو ان عقلمند خاتون نے جواب دیا کہ وہ میں نے حفاظت سے زمین میں دفن کی ہوئی ہے۔ دوسرے دن صبح جب فروخ مسجد میں نماز پڑھنے گئے تو بیٹے کا وہ رتبہ دیکھا کہ بڑے بڑے عالم زانوئے تلمذ طے کیے سامنے بیٹھے تھے۔ نہایت شاداں و فرحاں واپس آئے اور بیوی سے ذکر کیا تو اُن دانا خاتون نے جواب دیا کہ یہی وہ زمین ہے جس میں میں نے آپ کا چھوڑا ہوا اثاثہ دفن کر رکھا ہے۔!

علامہ اقبال اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہمارے ہاں ایک فقیر آیا جو ٹلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس پر مجھے غصّہ آیا اور میں نے اُسے مارا، تو جو کچھ وہ مانگ کر لایا تھا، وہ نیچے گر گیا۔ میرے والد نے جب یہ منظر دیکھا تو اُن کا رنگ زرد ہوگیا اور مجھے بلا کر کہا کہ "اے بیٹے! ذرا خیال کر کہ قیامت کے دن جب جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار لگا ہوگا اور بڑے بڑے حافظ، غازی، شہید، زاہد، عاشقانِ الٰہی اور عالم وغیرہ جمع ہوں گے تو یہ فقیر وہاں آکر فریاد کرے گا اور حضورؐ مجھ سے پوچھیں گے کہ تمہیں گوشت کا ایک

ٹکڑا عطا کیا گیا تھا، کیا تو اُسے انسان نہ بنا سکا۔ تو بیٹا بتا کہ اس وقت میں کیا جواب دونگا۔ اے بیٹے! باپ پر یہ ظلم نہ کر اور غلام کو اپنے آقا کے حضور میں شرمندہ نہ کر۔"

اس میں کچھ تعجب کی بات نہیں کہ جس بچّے کی بچپن میں اس حکیمانہ انداز میں تربیت کی گئی تھی وہ بڑا ہو کر ایک بہت بڑا خادمِ دین اور عاشقِ رسولؐ ثابت ہوا۔

یہ تو ان لوگوں کی باتیں ہیں جنہوں نے دنیا میں بڑی شہرت، ناموری اور نیک نامی حاصل کی۔ ہم عام لوگوں کی زندگیوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جہاں جہاں والدین نے فرض شناسی سے کام لیا اور بچوں کی تربیت کا حق ادا کرنے کی کوشش کی، اللہ تعالےٰ نے اُن کی کوششوں کو آخر کامیابی ہی سے ہمکنار فرمایا۔

خدا کے دین کو چاہنے والی ایک خاتون زندگی میں کچھ ایسی تکالیف کا شکار ہوئیں کہ گھر چھوڑ کر کسی رشتے دار کے پاس رہنا پڑ گیا۔ بچّے چھوٹے چھوٹے تھے اور حالات کی تبدیلی کا پورا احساس نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خاتون صبح اٹھ کر سب کے لئے ناشتہ تیار کرتیں اور گھر والی بی بی کے بچوں کو پہلے دیتیں اور اپنے بچوں کو بعد میں۔ بچّے بے چارے سمجھتے تھے کہ چونکہ ہماری ماں ناشتہ تیار کر رہی ہے اس لئے پہلا حق ہمارا ہے۔ وہ اس ترتیب کو بے انصافی پر محمول کرنے لگے۔ ایک دن ایک بچّہ پریشان ہو کر بول اُٹھا کہ امّی! آخر آپ کیوں یہاں آئی ہیں۔ اچھے بھلے ہم اپنے گھر میں رہ رہے تھے۔ ماں نے بڑے آرام سے کہا کہ بیٹے! کاہے کے لئے گھبرا رہے ہو۔ یہاں کیا ہمیشہ رہنا ہے؟ بچّہ بگڑ کر بولا کہ اب آپ ہمیں اور کہاں لے جانے کا ارادہ رکھتی ہیں؟ ماں نے بڑی بے ساختگی سے کہا —— "لو، اللہ میاں کے پاس نہیں جانا کیا؟ —— دیکھو بیٹے! تم ان بچوں کو پہلے ناشتہ کر لینے دیا کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو پھر جب ہم اللہ میاں کے پاس جائیں گے تو وہاں تم لوگوں کو پہلے ناشتہ ملا کرے گا۔" بچّے اس سیدھی سادی پُرخلوص بات کو فوراً سمجھ گئے اور صبر سے اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔

۵۔ شفقت و محبت

بچّے کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اس سے شفقت و محبت کا سلوک کیا جائے۔ اس معاملے

میں بے جا لاڈ پیار، جو بچّے کو بگاڑ دے، درست نہیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ بچّے کو یقین رہے کہ ماں باپ اسے دل سے چاہتے ہیں اور اُس کے سچّے خیر خواہ ہیں۔ بچّے سے بہت زیادہ سختی کرنا اُسے سدھارنا نہیں بلکہ بگاڑنا ہے۔ اگر کسی بچّے کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ ماں باپ کو مجھ سے محبت نہیں اور وہ مجھے بُرا سمجھتے ہیں تو یہ بچّے اور والدین دونوں کی بدقسمتی ہوگی۔ اس لئے والدین کے لئے ضروری ہے کہ اپنا طرزِ عمل ایسا رکھیں کہ بچّے کو ان کی محبت اور خیر خواہی پر یقین رہے۔ یہ یقین اس میں اعتماد پیدا کرے گا اور وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھے گا، جس سے اس کی سیرت پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ آیئے، اب دیکھیئے کہ اس معاملے میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل کیا تھا۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ کچھ دیہاتی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انھوں نے حضورؐ سے پوچھا کہ کیا آپؐ اپنے بچوں کو چومتے ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں! انھوں نے کہا، لیکن خدا کی قسم! ہم تو نہیں چومتے۔ (اس پر) حضورؐ نے فرمایا کہ اگر اللہ نے تمہارے دل سے رحم نکال لیا ہو تو پھر میرا کیا اختیار۔ (مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ اقرع بن حابس نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ حضرت حسنؓ کو چوم رہے ہیں۔ اقرع نے کہا کہ میرے دس بیٹے ہیں، میں نے ان میں سے ایک کو (بھی) کبھی نہیں چوما۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم کیا بھی نہیں جاتا۔ (مسلم)

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو اپنے بال بچوں پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ شفقت کرتا ہو۔ (مسلم)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت فاطمہؓ سے بے انتہا محبت تھی، مسوّر بن مخرمہ ایک حدیث بیان کرتے ہیں جس میں انھوں نے حضورؐ کا یہ فرمان روایت کیا ہے کہ ”فاطمہؓ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، جو چیز اسے بُری لگتی ہے وہ مجھے بُری لگتی ہے اور جو چیز اُسے اذیت دیتی ہے وہ مجھے اذیت دیتی ہے۔“ (ابوداؤد)

بُرا لگنے سے مراد ہے قلق اور رنج پہنچنا۔ حضورؐ کی مراد یہ تھی کہ جب حضرت فاطمہؓ کو قلق

اور رنج پہنچتا ہے تو مجھے بھی قلق اور رنج پہنچتا ہے۔

حضورؐ اپنے نواسوں پر بھی بے انتہا شفقت فرماتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں دن کے کسی وقت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلا (ہم دونوں خاموش تھے) نہ آپؐ مجھ سے بات کر رہے تھے نہ میں آپؐ سے، یہاں تک کہ آپؐ بنو قینقاع کے بازار میں پہنچے۔ پھر آپؐ لوٹے اور حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لائے اور فرمایا "کیا یہاں کوئی چھوٹا بچہ ہے، کیا یہاں کوئی چھوٹا بچہ ہے۔" آپؐ کی مراد حضرت حسنؓ تھے۔ ہم نے سمجھا کہ اُن کی والدہ نے انہیں نہلانے اور خوشبودار ہار پہنانے کے لئے روکا ہوا ہے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ دوڑتے ہوئے آئے یہاں تک کہ دونوں (یعنی حضورؐ اور حضرت حسنؓ) ایک دوسرے سے گلے ملے اور حضورؐ نے فرمایا کہ اے خدا! میں اس سے محبت رکھتا ہوں، پس تو بھی اس سے محبت رکھ اور اس سے بھی محبت رکھ جو اس سے محبت رکھے۔ (مسلم)

حضرت ابوسعیدؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حسنؓ اور حسینؓ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔ (ترمذی)

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اپنے اہلِ بیت میں سے آپؐ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے۔ آپؐ نے فرمایا: حسنؓ اور حسینؓ! اور آپؐ حضرت فاطمہؓ سے فرماتے کہ میرے دونوں بیٹوں کو میرے پاس لاؤ۔ پھر آپؐ دونوں کو سونگھتے اور سینے سے لگا لیتے۔ (ترمذی)

حضرت براءؓ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اُن کے گھر چلا گیا تو دیکھا کہ ان کی صاحبزادی حضرت عائشہؓ لیٹی ہوئی تھیں، انہیں بخار تھا۔ میں نے ان کے باپ (یعنی حضرت ابوبکرؓ) کو دیکھا کہ انھوں نے اُن کے رُخسار پر بوسہ دیا اور فرمایا کہ اے پیاری بیٹی! تیری طبیعت کیسی ہے؟ (بخاری)

غرضیکہ بچوں کے ساتھ شفقت و محبت کا سلوک کرنا ضروری ہے کیونکہ بچے کی سیرت سازی کے لئے اس کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ خدا کے بعد بچے کی جائے پناہ اس کے

والدین ہی ہوتے ہیں۔ جو والدین بچے کے لئے مناسب شفقت و محبت کا اظہار کرتے رہیں گے وہ اسے یقین دلائیں گے کہ اس کی یہ جائے پناہ مضبوط ہے۔ اس کے برعکس بچے سے خواہ مخواہ سختی کرنا یا بہت زیادہ سختی کرنا چاہے اسے ادب سکھانے ہی کے لئے کیوں نہ ہو، بچّے کے لئے بہت زیادہ پریشانی اور بے اعتمادی کا باعث بن جاتی ہے۔

شیخ سعدیؒ نے ایک حکایت بیان کی ہے کہ ایک باپ نے اپنے بیٹے کو ڈنڈے سے مارا تو بیٹا بولا کہ ابّا! بے قصور نہ ماریئے۔ اگر لوگ مجھ پر ظلم کریں تو میں اُن کے ظلم کی فریاد آپ کے پاس کرسکتا ہوں لیکن جب آپ ظلم کریں تو کس کے پاس فریاد کروں۔"

۶۔ دعا

والدین پر بچّے کا ایک خاص حق یہ بھی ہے کہ وہ اس کے لئے دعا کریں۔ یہ تو ایک حقیقت ہے کہ والدین بچے کے انتہائی خیر خواہ ہوتے ہیں اور اُن کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کے بچے لائق، فائق، نیک اور عمدہ اخلاق کے مالک ہوں۔ مگر اس قلبی خواہش کے باوجود یہ عین ممکن ہے کہ وہ ان کی صحیح تربیت نہ کرسکیں اور یہ خواہش صرف خواہش ہی کی حد تک رہے، اس کے لئے کوئی عملی کوشش نہ کی جائے، پھر اس کا بھی امکان موجود ہے کہ بعض والدین میں وہ سمجھ بوجھ، عقل و دانش اور صبر و حوصلہ ہی نہ ہو جو بچّے کی عمدہ تربیت کے لئے درکار ہوتا ہے، پھر اس کا بھی خدشہ موجود ہے کہ بعض والدین اس شدت سے اور ایسے مبالغہ آمیز انداز میں بچوں کی تربیت کرنا شروع کردیں کہ بچّے سدھرنے کے بجائے اُلٹے باغی ہوجائیں۔

غرضکہ بچّے کی تربیت کے لئے جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے اس کے بے ڈھنگے پن سے سرانجام دیئے جانے یا فوری طور پر ناکام ہوجانے کا خدشہ بہرحال موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا بچے کی خیرخواہی کے سلسلے میں اس عمل سے ذرّہ بھر بھی غفلت نہیں برتنی چاہیئے جس کے ناکام ہوجانے کا قطعی کوئی خدشہ نہیں اور جو انشاء اللہ ہمیشہ بچے کے لئے کامیابی ہی لاتا ہے اور وہ عمل ہے بچّے کے حق میں دعائے خیر کرنا!

اللہ تعالیٰ کلام پاک میں فرماتا ہے کہ :

اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ لا "پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار (البقرہ : ۱۸۶) سنتا اور جواب دیتا ہوں۔"

جب وہ ہر معاملے میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہے تو اُس پکار کو کیوں نہ سُنے گا جو اس کی عزیز مخلوق کی خیر خواہی کے لئے کی جائے۔ ہمارے بچے ہماری اولاد کم ہیں، اور اُس کی مخلوق زیادہ ہیں۔ وہ انہیں ہم سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ اُن کے حق میں ہماری دعا نہ سُنے۔ اوپر حضرت ابنِ مبارکؒ کے حالات بیان کیے جاچکے ہیں کہ کس طرح ماں باپ کی مسلسل دعا اور التجا سے خدا کی رحمت جوش میں آئی اور ایک عیش وعشرت کا دلدادہ لا اُبالی نوجوان عالمِ اسلام کے عالموں اور عاملوں کا سردار بن گیا۔ والدین کو جس معاملے میں کبھی بھی سستی نہیں دکھانی چاہیئے اور کبھی بھی نہیں اُکتانا چاہیئے وہ یہی ہے کہ بچوں کے حق میں دعائے خیر جاری رکھی جائے۔ عجب نہیں کہ یہی شے انہیں دین اور دنیا دونوں کے خزانے عطا فرمادے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی ہے جو اپنے بیوی بچوں کے لئے دعائے خیر کرتے رہتے ہیں:

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ۔ "اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولادوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت (الفرقان : ۷۴) فرما۔"

۷۔ حقِ وراثت

مندرجہ بالا حقوق کے علاوہ بچّے کو کچھ اور حقوق بھی حاصل ہیں جن میں ایک حقِ وراثت ہے۔ اسلام میں اصولِ وراثت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ساری اولاد، ترکے کی وارث بنتی ہے۔ اس میں بڑے چھوٹے اور لڑکے لڑکی کا کوئی فرق نہیں۔ ورثے کے معاملے

میں بعض دوسرے مذاہب اور طریقہ ہائے زندگی میں لڑکی کے ساتھ سخت بے انصافی کی گئی ہے اور اسے باپ کے ترکے کا حقدار نہیں سمجھا گیا۔ بعض اقوام میں ورثہ صرف بڑے لڑکے کا حق سمجھا جاتا ہے اور چھوٹے بچوں کو محض اس لئے محروم ہونا پڑتا ہے کہ وہ اتفاق سے بعد میں پیدا ہوئے تھے، لیکن اسلام میں سب بچے ورثے کے حقدار ہیں۔ تقسیم کا اصول یہ ہے کہ لڑکی کو لڑکے سے آدھا حصّہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے عورت کے کندھے پر کوئی مالی بوجھ نہیں ڈالا۔ شادی سے پہلے باپ اس کا کفیل ہوتا ہے، شادی کے بعد خاوند اور بیوگی کی صورت میں بیٹا۔ لہٰذا وہ آدھا لے کر بھی نفع میں رہتی ہے۔ اس کے برعکس اس کے بھائی نے اپنے اخراجات کے علاوہ اپنے بیوی بچوں کے اخراجات بھی پورے کرنے ہوتے ہیں۔ بوڑھے ماں باپ کی دیکھ بھال بھی کرنی ہوتی ہے اور بعض اوقات بیوہ بہنوں کی خبرگیری کا ذمہ بھی اُٹھانا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ عین انصاف ہے کہ اُسے زیادہ دیا جائے۔

ورثے کے معاملے میں بچوں کے حقوق پر جو زور دیا گیا ہے وہ اسی سے ظاہر ہے کہ کسی مورث کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اپنے مال کے ۱/۳ حصّے سے زیادہ کی کوئی وصیت کر جائے۔

حضرت عامرؓ بن سعد بیان کرتے ہیں کہ میں مکّہ مکرمہ میں بیمار تھا اور حضورؐ میری عیادت کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ میرے پاس مال ہے۔ کیا میں اپنے سارے مال (کو خدا کی راہ میں دے دینے) کی وصیت کر دوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ نہیں (ایسا نہ کرو) میں نے عرض کیا کہ پھر نصف مال کی (وصیت کر دوں) آپؐ نے (پھر) فرمایا کہ نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ کیا پھر تیسرے حصّے کی (وصیت کر دوں) آپؐ نے فرمایا کہ (ہاں) تیسرے حصّے میں کر سکتے ہو، اگرچہ تیسرا حصّہ بھی زیادہ ہے۔ (پھر حضورؐ نے فرمایا) یہ کہ تو اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ جائے، اس سے بہتر ہے کہ تو انہیں تنگدست چھوڑ جائے اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ . . . . (بخاری)

اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضورؐ نے اس بات کی بھی اجازت نہیں دی کہ

کوئی شخص اپنے سارے ترکے کو خدا کی راہ میں دینے ہی کی وصیّت کرے۔ البتہ تیسرے حصّے کے بارے میں وہ وصیت کرسکتا ہے۔

۸۔ دیگر حقوق

بچّے کا والدین پر ایک اور حق یہ ہے کہ وہ اس کا نام اچھا رکھیں۔

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باپ پر بچے کا یہ حق ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اُسے حسنِ ادب سے آراستہ کرے۔

(شعب الایمان بیہقی)

ایسے ہی اولاد کا والدین پر یہ بھی حق ہے کہ وہ انہیں نیکی اور نیک نامی ورثے میں دیں، بُرائی اور بدنامی نہ دیں۔ جس طرح بے راہ رو اولاد والدین کے لئے باعثِ ننگ ہوتی ہے اسی طرح غلط کار والدین بھی اولاد کے لئے ساری عمر شرمندگی، عار اور اذیت کا باعث بنے رہتے ہیں۔

اولاد کے معاملے میں والدین کی ایک بھاری ذمہ داری یہ ہے کہ مناسب عمر تک پہنچ جانے پر ان کے نکاح کا بندوبست کریں۔

حضرت ابو سعیدؓ اور حضرت ابنِ عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ اولاد دے، اُسے چاہیئے کہ اس کا اچھا سا نام رکھے اور اُسے ادب سکھائے۔ پھر جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچ جائے تو اس کی شادی کر دے۔ اگر (بچّہ) سنِ بلوغ کو پہنچ گیا مگر (باپ نے) اس کی شادی نہ کی اور (نتیجہ یہ ہوا کہ) وہ حرام میں مبتلا ہوگیا، تو اُس کا باپ اس گناہ کا ذمہ دار ہوگا۔ (شعب الایمان بیہقی)

۹۔ عصرِ حاضر میں دینی تعلیم و تربیت کی ضرورت

جس دَور میں سے ہم گزر رہے ہیں اس کی بعض خصوصیات نے والدین کے لئے اس بات کو اور بھی زیادہ ضروری کر دیا ہے کہ وہ بچوں کے دلوں میں خدا کی محبت اور خوف،

رسولؐ کی پیروی کا اشتیاق اور آخرت کی بہتری کی تڑپ پیدا کریں۔ کیونکہ طرزِ زندگی میں کچھ ایسی تبدیلیاں آگئی ہیں کہ بچے، یہاں تک کہ لڑکیاں بھی، دن کا بہت سا حصّہ والدین کی نگاہوں سے دُور رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ ازحد ضروری ہے کہ ان کے اپنے دلوں میں صحیح اور غلط کی پوری پہچان اور صحیح پر عمل کرنے اور غلط سے اجتناب کرنے کا جذبہ پیدا ہو چکا ہو اور ان کے دلوں میں یہ بات نقش ہو کہ والدین تو نہیں دیکھتے مگر ہمارا خالق ہمیں ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ یہی شے ان کی حفاظت کرے گی اور انہیں خرابیوں سے محفوظ رکھ سکے گی۔

پھر تہذیب و تمدن کی ترقی نے زندگی میں بہت بے چینی، اُلجھنیں اور طرح طرح کے مسائل پیدا کر دیے ہیں جن کے باعث انسانی اعصاب پر بے انتہا دباؤ پڑ رہا ہے۔ ایسے مہلک ہتھیار وجود میں آچکے ہیں کہ اگر انھیں استعمال میں لے آیا جائے تو عجب نہیں کہ کرۂ ارض ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے۔ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے اور معیارِ زندگی کو بڑھانے کی دُھت نے انسان کا چین چھین لیا ہے۔ پھر ذرائع رسل و رسائل کی ترقی کے باعث مختلف ممالک اس طرح ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں کہ ایک علاقے کی بے چینی بے شمار دوسرے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس صورتِ حالات میں انسان کو ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے جو اس کے دل و دماغ اور اعصاب کو اتنی قوت بخشے کہ وہ اس دباؤ کا کامیابی سے مقابلہ کر سکے اور یہ سہارا صرف خدا پر سچا یقین ہے جو والدین بچوں کو یہ ایمان اور یقین نہیں دیتے وہ بچوں پر ظلم کرتے ہیں کہ بغیر ہتھیار دیے انہیں ایک ہولناک جنگ میں دھکیل دیتے ہیں۔

خود عالمِ اسلام کا یہ حال ہے کہ علاقائی تعصبات اور بہت سے اور جاہلانہ نظریات نے ملّتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اس طرح پارہ پارہ ہو جانے کے باعث وہ دنیا میں بھی شکست اور ذلت کا شکار ہو رہی ہے۔ ہر مسلمان ماں اور مسلمان باپ کا فرض ہے کہ بچے کے دل میں حبِ اسلام اور اخوتِ اسلامی کو راسخ کرنے کی کوشش کرے۔ یہی شے اُن کی انفرادی زندگی میں بھی سکون و اطمینان پیدا کرے گی اور اسی

سے ملتِ اسلامیہ کو بھی وہ قوت حاصل ہوگی جس سے وہ اقوامِ عالم کے درمیان اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے۔

۱۰- بیٹی کی اہمیت

اولاد کے حقوق کا ذکر اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک یہ نہ واضح کیا جائے کہ جس بیٹی کو جاہلیت میں ننگ و عار کا باعث سمجھا جاتا تھا، اسلام نے آکر اسے کیا مقام عطا فرمایا۔

حضرت ابنِ عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی بیٹی ہو، پھر نہ تو وہ اُسے زندہ دفن کرے اور نہ اسے ذلیل سمجھے اور نہ اپنے بیٹے کو اس پر ترجیح دے تو اللہ جنت میں داخل کرے گا۔ (ابوداؤد)

حضرت ابوسعید خُدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے تین بیٹیوں کی پرورش کی، پھر انہیں اچھی تعلیم و تربیت دے کر اُن کی شادی کردی اور ان سے اچھا سلوک کیا تو اس کے لئے جنت ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت عُقبہؓ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ جس شخص کی تین بیٹیاں ہوں اور وہ اُن کے معاملے میں صبر سے کام لے اور اپنی کمائی سے اُنہیں کھلائے اور پلائے اور پہنائے تو وہ بیٹیاں قیامت کے دن اس کے لئے آگ سے بچاؤ (کا ذریعہ) ہو جائیں گی۔ (ابن ماجہ)

حضرت سُراقہؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تجھے سب سے زیادہ فضیلت والا صدقہ نہ بتا دوں؟ (سب سے زیادہ فضیلت والا صدقہ) تیری وہ بیٹی ہے جو (خاوند کی وفات یا طلاق کے باعث) تیری طرف واپس آگئی ہو اور تیرے سوا اس کا کوئی کمانے والا نہ ہو (ایسی بیٹی پر خرچ کرنا افضل صدقہ ہے)۔ (ابن ماجہ)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس ایک عورت آئی اور اس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ اس نے سوال کیا اور میرے پاس ایک کھجور کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے اسے وہی دے دی۔ اس نے اس کھجور کو اپنی دونوں بیٹیوں کے درمیان تقسیم کردیا اور خود اس

میں سے کچھ نہ کھایا۔ پھر اُٹھ کھڑی ہوئی اور چلی گئی جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے تو میں نے آپؐ کو یہ بات بتائی تو آپؐ نے فرمایا کہ جو کوئی ان لڑکیوں کے بارے میں کسی آزمائش میں مبتلا ہو جائے (پھر وہ اُن سے حسن سلوک کرے) تو یہ لڑکیاں اس کے لئے جہنم کی آگ سے پردہ ہو جائیں گی۔ (بخاری، مسلم)

حضرت انس رضؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے دو لڑکیوں کی پرورش کی، یہاں تک کہ وہ سنِ بلوغ کو پہنچ گئیں تو وہ قیامت کے دن (اس حالت میں) آئے گا کہ میں اور وہ ایسے ہوں گے اور آپؐ نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو ایک دوسری سے ملا دیا (کہ ایسے قریب جیسے یہ انگلیاں ہیں) (مسلم)

رشتے داروں کے حقوق

حضرت ابوایوبؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے کہ ایک بدّو آپؐ کے سامنے آگیا اور آپؐ کے ناقہ کی نکیل یا اس کی رسّی پکڑلی اور پھر عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ یا (یوں کہا کہ) یا محمدؐ مجھے بتائیے کوئی ایسا عمل جو مجھے جنت کے قریب کردے اور دوزخ سے دُور کردے۔ راوی کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم رُک گئے اور پھر اپنے صحابہؓ پر ایک نگاہ ڈالی اور فرمایا کہ اسے (نیکی کی) توفیق دی گئی ہے یا (یوں فرمایا کہ) اسے ہدایت دی گئی ہے (پھر اس بدو سے مخاطب ہوکر) فرمایا کہ تم نے کیا کہا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ اس نے اپنی بات دہرائی تو حضورؐ نے (اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے)... فرمایا کہ :

تو اللہ کی عبادت کر،
اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر،
اور نماز قائم کر،
اور زکوٰۃ ادا کر،
اور صلۂ رحمی کر،

(اور پھر فرمایا کہ اب ہمارے) ناقہ کو چھوڑ دے۔ (مسلم)

یہ "صلۂ رحمی" جس کا حضورؐ نے حکم فرمایا، حضورؐ ہی کے فرامین کی روشنی میں یہ ہے کہ:
رشتے داروں سے تعلقات قائم رکھے جائیں، توڑے نہ جائیں،

اُن کے دُکھ سُکھ میں شرکت کی جائے،
اُن سے حسنِ سلوک کیا جائے،
اُنہیں مالی اور جسمانی دونوں اقسام کی امداد دی جائے،
اور اگر وہ صلہ رحمی نہ بھی کریں تو بھی اُن سے صلہ رحمی کی جائے۔

۱۔ صلہ رحمی کی تاکید

سورۃ النساء کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ط

"اُس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔"

ایسے ہی سورۃ الروم، آیت ۳۸ میں حکم دیا ہے:

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ط ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ز

"پس (اے مومن) رشتے دار کو اس کا حق دے اور مسکین و مسافر کو (اس کا حق) یہ طریقہ بہتر ہے اُن لوگوں کے لئے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہوں۔"

واضح رہے کہ یہاں "یہ نہیں فرمایا کہ رشتے دار، مسکین اور مسافر کو خیرات دے۔ ارشاد یہ ہوا ہے کہ یہ اُس کا حق ہے جو تجھے دینا چاہیئے، اور حق ہی سمجھ کر تو اُسے دے۔ اس کو دیتے ہوئے یہ خیال تیرے دل میں نہ آنے پائے کہ یہ کوئی احسان ہے جو تو اُس پر کر رہا ہے اور تو کوئی بڑی ہستی ہے دان کرنے والی، اور وہ کوئی حقیر مخلوق ہے تیرا دیا کھانے والی، بلکہ یہ بات اچھی طرح تیرے ذہن نشین رہے کہ مال کے مالکِ حقیقی نے اگر تجھے زیادہ دیا ہے اور دوسرے بندوں کو کم عطا فرمایا ہے تو یہ زائد مال ان دوسروں کا حق ہے جو تیری آزمائش کے لئے تیرے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے تاکہ تیرا مالک دیکھے کہ تو اُن کا حق پہچانتا ہے یا نہیں۔" (تفہیم القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۷۵۸)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص

اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اُسے چاہیئے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اُسے چاہیئے کہ صلۂ رحمی کرے، اور جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اُسے چاہیئے کہ بھلائی کی بات کرے یا پھر خاموش رہے۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نسب کی اتنی تعلیم حاصل کرلو جس سے اپنے رشتے داروں سے مل سکو، کیونکہ صلۂ رحمی سے اپنے لوگوں میں محبت پیدا ہوتی ہے، مال بڑھتا ہے اور موت پیچھے ہٹتی ہے (یعنی عمر لمبی ہوتی ہے)۔ (ترمذی)

سورۃ النحل، آیت ۹۰ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی ٥ "اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور رشتے داروں کو دینے کا۔"

"اس مختصر سے فقرے میں تین ایسی چیزوں کا حکم دیا گیا ہے جن پر پورے معاشرے کی دوستی کا انحصار ہے۔ پہلی چیز عدل ہے ..... دوسری احسان ہے ..... تیسری صلۂ رحمی ہے جو رشتے داروں کے معاملے میں احسان کی ایک خاص صورت متعین کرتی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتے داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں اُن کا شریکِ حال ہو اور جائز حدود کے اندر اُن کا حامی و مددگار بنے بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحبِ استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتے داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔ شریعتِ الٰہی ہر خاندان کے خوشحال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا ننگا نہ چھوڑیں۔ اس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہو اور اس کے خاندان میں اُس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ شریعت خاندان کو معاشرے کا ایک اہم عنصر ترکیبی قرار دیتی ہے اور یہ اصول پیش کرتی ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوشحال افراد پر ہے۔ پھر دوسروں پر اُن کے حقوق عائد ہوتے ہیں اور ہر خاندان کے خوشحال

افراد پر پہلا حق اُن کے اپنے غریب رشتے داروں کا ہے، پھر دوسروں کے حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، چنانچہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اولین حقدار اُس کے والدین، اس کے بیوی بچے اور اُس کے بھائی بہن ہیں، پھر وہ جو اُن کے بعد قریب تر ہوں، پھر وہ جو اُن کے بعد قریب تر ہوں اور یہی اصول ہے جس کی بناء پر حضرت عمرؓ نے ایک یتیم بچے کے چچازاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار ہوں اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپؓ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتے دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا —— اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس معاشرے کا ہر واحدہ اس طرح اپنے اپنے افراد کو سنبھال لے، اس میں معاشی حیثیت سے کتنی خوشحالی، معاشرتی حیثیت سے کتنی حلاوت اور اخلاقی حیثیت سے کتنی پاکیزگی اور بلندی پیدا ہو جائے گی۔" (تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحہ ۵۶۵)

۲۔ صلۂ رحمی کی فضیلت

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رشتے داری رحمان کی ایک شاخ ہے، پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ (اے رشتہ داری) جو تجھے جوڑے گا میں اس سے جُڑوں گا اور جو تجھے کاٹے گا میں اس سے کٹ جاؤں گا۔ (بخاری)

مراد یہ ہے کہ جو شخص رشتے داروں سے تعلقات قائم رکھے گا، اُن سے حسنِ سلوک کرے گا اُسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو گا اور اس کی رحمت اس پر سایہ کرے گی۔ اس کے برعکس جو رشتے داروں سے تعلقات توڑے گا، اُن سے بدسلوکی کرے گا اور اُن کے حقوق ادا کرنے سے غفلت برتے گا وہ خدا کی رحمت سے دُور ہو جائے گا۔

حضرت سلمانؓ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی روزہ افطار کرے تو کھجور پر افطار کرے، کیونکہ وہ برکت والی چیز ہے۔ اور اگر کھجور نہ پائے تو پانی پر افطار کرے، کیونکہ یہ بڑی پاک چیز ہے اور حضورؐ نے (یہ بھی)

فرمایا کہ (غیر رشتہ دار) مسکین کو صدقہ دینا تو صرف صدقہ ہے اور رشتہ دار کو صدقہ دینے میں (ثواب کی) دو باتیں ہیں (کیونکہ ایک تو یہ) صدقہ (ہے) اور (دوسرے یہ) صلۂ رحمی (بھی ہے)۔ (ترمذی)

حضرت انسؓ ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو طلحہؓ انصار میں سب سے زیادہ مالدار تھے اور انہیں اپنے اموال میں سے (اپنا باغ) بیرُحا سب سے زیادہ عزیز تھا۔ یہ باغ مسجد نبویؐ کے سامنے تھا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے اور اس باغ کا عمدہ اور شیریں پانی پیا کرتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی :

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۃ

"تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اُس شئے کو (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جو تمہیں عزیز ہے۔"

تو ابو طلحہؓ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے خدا کے رسولؐ! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ. اور میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب مال بیرُحا ہے اور میں اسے خدا کی راہ میں خیرات کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے اس کے اجر و ثواب کا امیدوار ہوں۔ پس یا رسولؐ اللہ! آپؐ جیسے مناسب سمجھیں اس میں تصرف فرمائیں۔ اس پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ واہ واہ یہ تو مفید مال ہے، یہ تو مفید مال ہے (اس کا خیرات کرنا تمہیں بہت فائدہ بخشے گا، اچھا) تم نے جو کچھ کہا وہ میں نے سن لیا اور مجھے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تم یہ باغ اپنے رشتے داروں کو دے دو۔ اس پر حضرت ابو طلحہؓ نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! ایسے ہی کرتا ہوں اور انھوں نے اُس باغ کو اپنے رشتے داروں اور اپنے چچا زاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔ (بخاری، مسلم)

صلۂ رحمی کی فضیلت کے بارے میں حضورؐ نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ صلۂ رحمی سے آخرت کا ثواب ملنے کے علاوہ دنیا کے مادّی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے

سُنا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کا رزق کشادہ ہو اور اس کی عمر لمبی ہو تو اُسے چاہیئے کہ رشتے داروں سے حسنِ سلوک کرے۔ (بخاری)

حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی جس چیز کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے صرف کرے اس میں برکت ہوتی ہے اور وہ بڑھتی جاتی ہے۔ رشتے داروں سے حسنِ سلوک کرتے ہوئے انسان ایک تو اپنا مال اُن کے لئے خرچ کرتا ہے اور دوسرے اپنی زندگی کا کچھ وقت اُن کی خدمت میں صرف کرتا ہے۔ لہٰذا مال اور عمر دونوں میں برکت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر اسبابی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ جہاں اہلِ خاندان اور رشتے داروں میں ایک دوسرے سے محبت ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ کے شریک ہوتے ہیں وہاں دلوں میں خوشی اور اطمینان زیادہ ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی مالی خدمت کر کے ایک دوسرے کو احتیاج سے بچاتے ہیں۔ مگر جہاں رشتے دار ایک دوسر سے بدسلوکی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی تنگی و تکلیف میں کام نہیں آتے، وہاں ظالم اور مظلوم دونوں ہی جلن، کڑھن اور اضطراب کا شکار رہتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ احتیاج اور بیماریاں ہیں جو آخر عمر پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

مشہور تابعی حضرت سعیدؓ بن مسیّب کا ایک قول ہے کہ اس دولت دنیا میں کوئی خیر نہیں جس کو انسان اس نیت سے حاصل نہیں کرتا کہ اُس کے ذریعہ اپنے مذہب اور اپنی شرافت کو بچائے اور رشتے داروں سے حسنِ سلوک کرے۔

ویسے تو سبھی رشتے دار صلۂ رحمی کے حق دار ہوتے ہیں۔ تاہم احادیثِ نبویؐ میں بعض رشتوں کا خصوصی طور پر ذکر آیا ہے۔

حضرت براءؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خالہ ماں کے درجے میں ہے ...... (ترمذی)

حضرت ابوہریرہؓ نے ایک روایت بیان کی ہے کہ جس کے آخر میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ کیا تم نہیں جانتے کہ آدمی کا چچا اس کے باپ کی طرح ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت ابوسعیدؓ خدری بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس

شخص کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں، یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں، پھر وہ اُن سے حسنِ سلوک کرے اور ان کے معاملے میں خدا سے ڈرے، تو اس کے لئے جنت ہے۔ (ترمذی)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے (رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میری جتنی ساتھی خواتین ہیں، سب کی کنیتیں ہیں (اور وہ اپنے اپنے کسی بچے کے نام سے اس کی ماں کہہ کر پکاری جاتی ہیں)، مگر میری کوئی کنیت نہیں۔ اس پر) حضورؐ نے فرمایا کہ تو بھی اپنے بیٹے عبد اللہ کے ساتھ کنیت رکھ لے (اور ام عبد اللہ کہلانا شروع کردے)...... (ابوداؤد)

جن عبد اللہ کا اس روایت میں ذکر آیا ہے، وہ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ تھے جو حضرت اسماءؓ کے بیٹے اور حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے۔ حضورؐ کے اس فرمان سے کہ "تو بھی اپنے بیٹے عبد اللہ کے ساتھ کنیت رکھ لے" یہ پایا جاتا ہے کہ حضورؐ نے بھانجے کو بھی بیٹے کی مانند قرار دیا۔

صحیح بخاری میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک دفعہ حضرت حمزہؓ کی ایک بچی کے بارے میں حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کے درمیان جھگڑا ہوگیا۔ اس وقت تک حضرت حمزہؓ شہید ہوچکے تھے اور مندرجہ بالا تینوں اصحاب میں سے ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ وہ بچی کو اپنے پاس رکھیں۔ اب صورت یہ تھی کہ حضرت جعفرؓ کی اہلیہ محترمہ اُس بچی کی خالہ تھیں۔ حضورؐ نے اس جھگڑے کا فیصلہ اس طرح چکایا کہ بچی کو حضرت جعفرؓ کے سپرد کردیا اور فرمایا کہ:

"خالہ بمنزلہ ماں کے ہے۔"

رشتے داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کے معاملے میں، جیسے کہ اوپر بیان ہوچکا، ترتیب کی بھی ہدایت فرمائی گئی ہے یعنی کہ جو رشتہ دار زیادہ قریبی ہے وہ پہلے حسنِ سلوک کا مستحق ہے، پھر جو اس کے بعد ہے، پھر جو اس کے بعد ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! انسانوں میں (میرے) حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تیری ماں، پھر تیری ماں، پھر تیری ماں، پھر تیرا باپ، پھر جو (باپ کے بعد رشتے میں) تیرے زیادہ قریب

ہو، پھر جو (اُس رشتے دار کے بعد رشتے میں) تیرے زیادہ قریب ہو۔ (مسلم)

۴۔ قطعِ رحمی کی مذمت

صلۂ رحمی کی تاکید اور فضیلت کے ساتھ ساتھ ہی قطعِ رحمی کے ایک شدید گناہ ہونے کی بھی وضاحت فرما دی گئی ہے۔ قطعِ رحمی یعنی رشتے داروں سے بدسلوکی کرنا اور اُن سے ملنا جُلنا بند کر دینا ایک ایسا ناپسندیدہ فعل ہے جس کے کرنے والے کو جنت کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

جُبیر بن مُطعم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رشتے داروں سے تعلق توڑنے اور اُن سے بدسلوکی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (ترمذی)

امام زین العابدین علیؒ کے بیٹے محمد بیان کرتے ہیں کہ میرے والد نے مجھے وصیت کی تھی کہ پانچ آدمیوں کے ساتھ کبھی نہ رہنا۔ میں نے عرض کیا: کون؟ فرمایا کہ فاسق کے ساتھ کہ وہ تمہیں ایک لقمے بلکہ اس سے بھی کم میں بیچ دے گا۔ میں نے پوچھا کہ اس سے کم کیا شے ہے۔ فرمایا کہ ایک لقمے کی طمع کی جائے اور وہ بھی نہ ملے۔ میں نے پوچھا کہ دوسرا کون ہے؟ فرمایا: بخیل! وہ اس چیز کو جس کی تمہیں سب سے زیادہ ضرورت ہوگی، تم سے علیحدہ کر دے گا۔ میں نے پوچھا! تیسرا کون؟ فرمایا کذاب! وہ سراب کی طرح قریب کو تم سے دُور کر دے گا اور دُور کو قریب۔ میں نے عرض کیا کہ چوتھا کون؟ فرمایا کہ احمق، کہ وہ تمہیں فائدہ پہنچانا چاہے گا مگر اُلٹا نقصان پہنچا دے گا۔ میں نے کہا: پانچواں کون؟ فرمایا: رشتہ داروں سے تعلق توڑنے اور اُن سے بدسلوکی کرنے والا۔ میں نے اُسے خدا کی کتاب میں تین مقامات پر ملعون پایا۔

جس طرح صلۂ رحمی آخرت کے ثواب کا ذریعہ بننے کے علاوہ دنیا میں بھی مفید ثابت ہوتی ہے اسی طرح قطع رحمی بھی ایک ایسا گناہ ہے کہ آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا میں بھی اس کی سزا مل جاتی ہے۔

حضرت ابو بکرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سرکشی اور قطع رحمی

سب گناہوں سے زیادہ اس بات کی مستحق ہیں کہ ان کا ارتکاب کرنے والے کو خدا تعالیٰ دنیا میں بھی سزا دے علاوہ اس سزا کے جو اُس نے اس کے لئے آخرت میں رکھی ہے۔ (ابوداؤد)

۴۔ رشتہ داری کیسے قائم رکھی جائے

اب سوال یہ ہے کہ جب صلۂ رحمی اتنی فضیلت والی چیز ہے اور قطع رحمی ایسا سخت گناہ ہے تو پھر کیا کیا جائے کہ رشتے داروں سے تعلقات منقطع ہونے اور ایک دوسرے کے ساتھ بدسلوکی کرنے کی نوبت نہ آئے؟ دیکھا تو یہی جاتا ہے کہ غیروں سے اتنے تعلقات خراب نہیں ہوتے جتنے رشتے داروں سے ہو جاتے ہیں۔ ذرا سی بات بڑھتے بڑھتے بہت بڑا فتنہ بن جاتی ہے اور بس پھر حسنِ سلوک کا تو ذکر ہی کیا، باہم سلام دعا تک بند ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات بڑے طمطراق سے اعلان کر دیا جاتا ہے کہ بس اب ہمیشہ کے لئے ختم۔ گویا کہ کسی بڑی نیکی کا عزم کیا جا رہا ہے ـــــ بعض لوگ تو اس گناہ کو فخر و مباہات کا ذریعہ بھی بنا لیتے ہیں اور اس بات پر نازاں ہوتے ہیں کہ ہمارا دل تو ایسا ہے کہ جب کسی طرف سے ہٹ گیا تو بس پھر ہٹ گیا۔ اور یہ کہ ہم نے کبھی کسی کو آگے بڑھ کر نہیں بلایا، دوسرے ہی ذلیل ہو کر ہمیں بلاتے ہیں حالانکہ حضورؐ کے فرمان کے مطابق جو رنجش کو دُور کرنے کے لئے پہلے سلام کر لے وہ بہتر آدمی ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رشتے داروں کے ساتھ تعلقات درست رکھنے کے لئے بڑے حوصلے، صبر و تحمل اور عفو و درگذر کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ بسا اوقات فریقین میں سے کسی نے بھی ارادی طور پر دوسرے سے کوئی بدسلوکی نہیں کی ہوتی، بس غلط فہمیوں ہی کی بنا پر وہ بڑھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے۔ اب اگر انسان یہ ریسرچ شروع کر دے کہ آغاز کس نے کیا تھا تو اس حقیقت تک پہنچنا تو محال ہوتا ہے، کیونکہ آغاز فی الحقیقت کسی نے بھی نہیں کیا ہوتا۔ لیکن اگر انسان اعلیٰ حوصلگی اور عفو و درگذر کا دامن پکڑ لے تو پھر کسی ریسرچ کی ضرورت ہی نہیں، جس نے بھی کیا ہو۔ بس ہم نے تو خدا اور خدا کے رسولؐ کے احکام پر عمل کرنا ہے۔ اگر بدسلوکی کا آغاز ہم نے کیا ہے تو پھر یہ اور بھی زیادہ ضروری بات ہے کہ صلح کی کوشش بھی ہمیں

کریں اور اگر بدسلوکی دوسری طرف سے شروع ہوئی ہے، تو پھر ہمارے لئے یہ زیادہ فضیلت کی بات ہے کہ ہم بے گناہ ہونے کے باوجود حالات کو درست کرنے کے لئے پہل کریں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت سے مطلع فرما دیا ہے کہ صحیح صلہ رحمی یہی ہے کہ ہم ان رشتہ داروں سے صلہ رحمی کریں جو ہم سے صلہ رحمی نہیں کرتے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو (اپنے رشتے داروں کی طرف سے کی گئی صلہ رحمی کے) جواب میں صلہ رحمی کرے بلکہ صلہ رحمی کرنے والا تو وہ ہے کہ جب اس سے قطع رحمی کی جائے تو وہ (اس کے جواب میں) صلہ رحمی کرے۔ (ترمذی)

ترمذی میں حضورؐ کا ایک فرمان نقل ہوا ہے کہ جو مسلمان لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اور اُن کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے وہ کہیں بہتر ہے اس شخص سے جو لوگوں سے الگ تھلگ رہتا ہے اور اُن کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں پر.... برداشتہ خاطر ہوتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں اُن سے صلہ رحمی کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قطع رحمی کرتے ہیں، میں اُن سے حسنِ سلوک کرتا ہوں اور وہ مجھ سے بُرائی کرتے ہیں۔ میں اُن کے ساتھ حلم سے پیش آتا ہوں اور وہ میرے ساتھ جہالت کا سلوک کرتے ہیں۔ اس پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے کہا ہے تو گویا تو انہیں گرم راکھ (یعنی بھوبل) پھنکا رہا ہے اور جب تک تو اس حالت پر قائم رہے گا خدا کی طرف سے ان کے خلاف ایک مددگار تیرے ساتھ رہے گا۔ (مسلم)

جسے یہ عزت اور طاقت مل جائے کہ خدا کی طرف سے ایک مددگار اُس کے ساتھ رہے اُسے اور کس شے کی ضرورت رہ جاتی ہے۔!

ہمسایوں کے حقوق

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیلؑ مجھے ہمسائے (کے حقوق) کے بارے میں برابر وصیت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مجھے خیال ہوا کہ وہ اُسے (ترکے کا) وارث (بھی) بنادیں گے۔ (بخاری)

اس حدیثِ پاک میں جو اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام میں حقوقِ ہمسایہ پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمسایہ چونکہ گھر کے قریب رہتا ہے اس لئے وہ دوسرے لوگوں کی نسبت بہتر طور پر دُکھ سُکھ کا ساتھی بن سکتا ہے۔ ایسے ہی گھر کے قرب ہی کے باعث اُسے دُکھ دینے اور ستانے کے مواقع بھی دُور رہنے والے لوگوں کی نسبت زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح گھروں کے بہت سے اندرونی راز بھی جو لوگ اپنے رشتے داروں سے بھی چھپانے کی کوشش کرتے ہیں ہمسایوں سے چھپانے مشکل ہوجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ہمسایہ بد باطن یا دشمن ہو تو وہ نہایت آسانی سے خاندان کو رسوا اور بدنام کرسکتا ہے۔ حقوقِ ہمسایہ پر زور دے کر اس بات کا بندوبست کیا گیا ہے کہ پاس پاس رہنے والے ایک دوسرے کے لئے راحت اور آرام کا باعث بنیں اور ایک دوسرے کی ایذارسانی سے بچ جائیں۔ اس کے علاوہ جس معاشرے میں ہمسائے کے حقوق ادا کرنے کا احساس ہوگا وہاں غریب طبقات کی امداد کی صورتیں بھی پیدا ہوتی رہیں گی اور غریب اور امیر کے درمیان جو اجنبیت کی خلیج ہے وہ بھی پُر ہوتی رہے گی، کیونکہ امیر ہمسایوں کو ہمسائے کے حقوق کی ادائیگی کی خاطر اپنے غریب ہمسائے سے ملنا جلنا اور معاشرتی تعلقات قائم کرنے پڑیں گے،

جس سے آپس کی اجنبیت اور غیریت دُور ہوگی۔ یہ اور ایسے ہی اور فوائد کے باعث ہمسائے کے حقوق ادا کرنے کی بہت تاکید فرمائی گئی ہے۔

۱۔ حسنِ سلوک

حضرت ابوشُریح عدویؓ بیان کرتے ہیں کہ میرے دونوں کانوں نے (حضورؐ کا یہ فرمان) سُنا اور جب حضورؐ فرمارہے تھے تو میری دونوں آنکھیں آپؐ کو دیکھ رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اُسے چاہیئے کہ اپنے ہمسائے کی عزت وتکریم کرے اور جو کوئی خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اُسے چاہیئے کہ اپنے مہمان کی عزت وتکریم کرے اور جو کوئی خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیئے کہ اچھی بات بولے یا پھر خاموش رہے۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوذرؓ جب تو شوربہ پکائے تو اس میں پانی زیادہ رکھ اور اپنے ہمسایوں کی خبرگیری کر (یعنی انہیں اس سالن میں سے تحفہ بھیج) (مسلم)

اس سے معلوم ہوا کہ ہمسائے سے حسن سلوک کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اُسے تحفہ بھیجا جائے۔ تحفے کے معاملے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسے قیمتی ہونا چاہیئے، حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ تحفہ ضرور بیش قیمت ہی ہو۔ اپنی استطاعت کے مطابق جیسا تحفہ بھی انسان دے سکے دینا چاہیئے، کیونکہ اس کا اصل مقصد دلوں میں باہمی الفت پیدا کرنا ہے نہ کہ اپنی امارت کا اظہار۔ اس لئے نہ تحفہ دینے والے کو یہ خیال کرنا چاہیئے کہ کوئی قیمتی شے ہو تو تحفہ دوں، معمولی شے کیا دوں اور نہ تحفہ لینے والے کے لئے مناسب ہے کہ وہ تحفہ دینے والے کے دل کی محبت کی طرف نگاہ کرنے کے بجائے تحفے کی قیمت کا اندازہ لگانا شروع کردے۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اے مسلمان عورتو! کوئی ہمسائی کسی ہمسائی کے لئے (تحفے کو) حقیر نہ سمجھے، چاہے (وہ تحفہ) بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو۔ (بخاری)

رشتے داری کی طرح ہمسایگت میں بھی ترتیب کا دھیان رکھنے کی ہدایت دی ہے جس ہمسائے کا دروازہ زیادہ قریب ہے وہ حسنِ سلوک کا زیادہ مستحق ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ! میرے دو ہمسائے ہیں تو ہیں ان میں سے کسے تحفہ بھیجوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جس کا دروازہ تجھ سے زیادہ قریب ہو۔ (بخاری)

حضرت عائشہ رضؓ کے بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ اُس وقت انھوں نے ایک ہی تحفہ بھیجنا تھا۔ چنانچہ حضورؐ نے دونوں ہمسایوں میں سے اس ہمسائے کو زیادہ مستحق قرار دیا جس کا دروازہ زیادہ قریب تھا۔ اگرچہ تحفے کے حقدار دونوں ہی تھے۔

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ وہ شخص مومن نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھاتا ہے اور اس کے پہلو میں اُس کا ہمسایہ بھوکا ہوتا ہے۔ (بیہقی)

معاویہ بن حیدہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمسائے کا حق یہ ہے کہ:

اگر وہ بیمار ہو تو تُو اس کی عیادت کرے،
اور اگر وہ انتقال کر جائے تو تُو اس کے جنازے کے ساتھ جائے۔
اور اگر وہ تجھ سے قرض مانگے تو تُو اسے (بشرط استطاعت) قرض دے،
اور اگر وہ کوئی بُرا کام کر بیٹھے تو تُو اس کی پردہ پوشی کرے،
اور اگر اسے کوئی نعمت ملے تو تُو اُسے مبارکباد دے،
اور اگر اُسے کوئی مصیبت پہنچے تو تُو اُسے تسلّی دلاسا دے،
اور تو اپنی عمارت اس کی عمارت سے اس طرح بلند نہ کرے کہ اس کے گھر کی ہوا بند ہو جائے،
اور تو اپنی ہنڈیا کی مہک سے اُسے اذیت نہ دے، اِلّا یہ کہ اس میں سے تھوڑا سا کچھ اُس کے گھر بھی بھیجے۔ (رواہ الطبرانی فی الکبیر)

ہنڈیا کی مہک سے اذیت دینے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تیرے گھر میں کوئی اچھا کھانا پک رہا ہو تو کوشش کر کہ اس کی مہک ہمسائے کے گھر میں نہ پہنچے۔ ایسا نہ ہو کہ اُسے غم ہو کہ وہ ایسا اچھا کھانا کھانے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ ہاں البتہ اگر تو ایسا کرے کہ جو اچھی شے پکائے اس میں سے ہمسائے کو بھی تحفہ بھیجے تو پھر حرج نہیں اگر اس کی مہک ہمسائے تک پہنچ جائے۔ اس فرمان سے درحقیقت مراد یہ ہے کہ ہر طرح سے ہمسائے کی خاطر داری کیجائے اسے آرام پہنچایا جائے، اس کی امداد کی جائے۔ اُس کے دکھ سکھ میں شرکت کی جائے اور دھیان رکھا جائے کہ ہماری کسی حرکت سے اُسے اپنی محرومی کا احساس نہ ہو۔ کیونکہ:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے ہاں بہترین دوست وہ لوگ ہیں جو اپنے دوستوں کے لئے بہترین ہیں اور اللہ کے ہاں بہترین ہمسائے وہ ہیں جو اپنے ہمسایوں کے لئے بہترین ہیں۔ (ترمذی)

امام غزالیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب احیاء علوم الدین میں ہمسایوں کے حقوق کی تفصیل یوں بیان فرمائی ہے:

۱۔ ہمسائے کو سلام میں پہل کرنا،
۲۔ اُس سے اُکتا دینے والی لمبی گفتگو نہ کرنا،
۳۔ اُس کی بار بار مزاج پُرسی کرنا،
۴۔ اگر وہ بیمار ہو تو اس کی تیمار داری کرنا،
۵۔ اگر وہ مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو اظہارِ ہمدردی کرنا،
۶۔ موت وغیرہ میں اس کا پورا ساتھ دینا،
۷۔ اگر اُسے کوئی خوشی حاصل ہو تو اُسے مبارکباد دینا اور اس کی خوشی میں شریک ہونا،
۸۔ اس کی لغزشوں اور غلطیوں سے درگذر کرنا،
۹۔ اپنی چھت سے اُس کے مکان پر نہ جھانکنا،
۱۰۔ اپنا پرنالہ اُس کے مکان یا صحن کی طرف رکھنے سے پرہیز کرنا،
۱۱۔ کوڑا کرکٹ اس کے مکان کے سامنے نہ ڈالنا،

۱۲۔ اس کے مکان کا راستہ تنگ نہ کرنا،
۱۳۔ وہ جو کچھ اپنے گھر میں لے جا رہا ہو اُسے غور سے نہ دیکھنا،
۱۴۔ اس کی کمزوریوں کو چھپانا اور اس کی پردہ پوشی کرنا،
۱۵۔ بوقتِ ضرورت اس کا پورا ساتھ دینا،
۱۶۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر کا پورا خیال رکھنا،
۱۷۔ اس کے خلاف کسی کی غیبت اور چغلی نہ سننا،
۱۸۔ اس کی عزت و حرمت سے نگاہ جھکا لینا،
۱۹۔ اُس کے ملازموں اور نوکرانیوں کی طرف نگاہ نہ اُٹھانا،
۲۰۔ اُس کے بچوں سے لاڈ پیار کرنا،
۲۱۔ جن دینی یا عام باتوں سے وہ بے خبر ہے اُن میں اس کی رہنمائی کرنا۔

یہ آخری بات بہت غور طلب ہے۔ ہمسائے کی خیر خواہی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اگر وہ دینی معاملات میں جاہل ہے تو حتی الامکان اسے علم سکھانے اور دین کے احکام سے واقف کرانے کی کوشش کی جائے۔

عَلقمہؒ اپنے والد عبدالرحمٰن کے واسطے سے اپنے دادا اَبزیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا ہو گیا ہے (دین کا علم رکھنے والے) لوگوں کو کہ وہ اپنے (علم دین سے ناواقف) ہمسایوں میں (دین کی) سمجھ بوجھ پیدا نہیں کرتے اور انہیں (دین کی) تعلیم نہیں دیتے اور انہیں وعظ و نصیحت نہیں کرتے اور انہیں (نیکی کرنے کا) حکم نہیں دیتے اور انہیں (برائی کرنے سے) نہیں روکتے ـــــ اور کیا ہو گیا ہے (علم دین سے ناواقف) لوگوں کو کہ وہ اپنے (عالم) ہمسایوں سے (علم دین) نہیں سیکھتے اور (اپنے میں) دین کی سمجھ بوجھ پیدا (کرنے کی فکر نہیں) کرتے اور نصیحت حاصل نہیں کرتے (پھر فرمایا) خدا کی قسم! (دین کا علم رکھنے والے) لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے (بے علم) ہمسایوں کو (دین کی) تعلیم دیں اور اُن میں (دین کی) سمجھ بوجھ پیدا کرنے کی کوشش کریں اور انھیں وعظ و نصیحت کریں اور انہیں (نیکی کرنے کا) حکم دیں اور انہیں (بُرائی کرنے سے) منع کریں اور (علم

دین نہ رکھنے والے) لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے (عالم) ہمسایوں سے (دین کا) علم حاصل کریں اور (اپنے میں دین کی) سمجھ بوجھ پیدا کریں اور نصیحت حاصل کریں (اگر ان دونوں گروہوں نے ایسا کر لیا تو خیر) ورنہ میں انھیں (اس گناہ کی) دنیا ہی میں سزا دِلوا دوں گا۔ (مسند اسحٰق بن راہویہ)

۲۔ ہمسایوں کی اقسام

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمسائے تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ ہمسایہ جسے صرف ایک حق حاصل ہے اور وہ حق کے لحاظ سے سب سے کم درجے کا ہمسایہ ہے اور (دوسرا) وہ ہمسایہ جسے دو حق حاصل ہیں، اور (تیسرا) وہ ہمسایہ جسے تین حقوق حاصل ہیں۔ جس ہمسائے کو ایک حق حاصل ہے وہ مشرک ہمسایہ ہے جس کے ساتھ کوئی رشتہ داری بھی نہ ہو۔ اُسے حقِ ہمسایگت حاصل ہے اور دو حق والا ہمسایہ وہ ہے جو مسلمان ہمسایہ ہے، اُسے ایک حق تو مسلمان ہونے کے باعث حاصل ہے (دوسرا) ہمسایہ ہونے کے باعث اور تین حقوق والا ہمسایہ وہ مسلمان ہمسایہ ہے جو (ساتھ ہی) رشتے دار (بھی) ہو۔ اسے ایک حق مسلمان ہونے کے باعث حاصل ہے، (دوسرا) ہمسایہ ہونے کے باعث اور (تیسرا) رشتے دار ہونے کے باعث۔

(رواہ البزّار فی مسند)

اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہمسائے کے ساتھ جتنا تعلق زیادہ گہرا ہو گا اتنے ہی اس کے حقوق زیادہ ہوں گے۔ جو شخص ہمسایہ ہونے کے علاوہ مسلمان بھی ہو اور رشتے دار بھی، اُس کے حقوق سب سے زیادہ ہیں۔ جو ہمسایہ مسلمان ہو اس کے حقوقِ اوّل الذکر سے کم ہوں گے مگر غیر مسلم ہمسائے سے زیادہ ہوں گے اور جو ہمسایہ غیر مسلم ہو گا اُسے بھی حقِ ہمسایگت ضرور حاصل ہو گا۔

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے لئے ان کے گھر والوں میں ایک بکری ذبح کی گئی۔ جب وہ تشریف لائے تو فرمایا کہ کیا تم لوگوں نے ہمارے یہودی ہمسائے

کو (گوشت کا) تحفہ بھیجا ہے؟ کیا تم لوگوں نے ہمارے یہودی ہمسائے کو (گوشت کا) تحفہ بھیجا ہے؟ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جبرئیلؑ مجھے ہمسائے کے معاملے میں برابر وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ وہ ہمسائے کو وارث بنا دیں گے۔ (ترمذی)

سید سلیمان ندوی ہمسائے کی اقسام بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وحی محمدیؐ نے ہمسائے کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسائے کو جگہ دی ہے جس کو عام طور سے پڑوسی یا ہمسایہ نہیں کہتے مگر وہ ہمسائے ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے، جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسے کے دو طالب علم، ایک کارخانے کے دو ملازم، ایک اُستاد کے دو شاگرد، ایک دکان کے دو شریک کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسایگت ہے اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے۔"

(سیرۃ النبیؐ جلد ۶، صفحہ ۲۷۹)

سورۃ النساء آیت ۳۶ میں فرمایا گیا ہے:

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ۔

"اور (خدا نے) ہمسایۂ قریب اور ہمسایۂ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ (نیکی کرنے کا حکم دیا ہے)"

یہاں تین لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے، ہمسایۂ قریب، ہمسایۂ بیگانہ اور پہلو کا ساتھی۔ ہمسایۂ قریب اور ہمسایۂ بیگانہ کے بارے میں سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

"اس "قریب" اور "بیگانہ" کے معنوں میں اہلِ تفسیر نے اختلاف کیا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ "قریب" کے معنی رشتہ دار و عزیز اور "بیگانہ" کے معنی غیر اور اجنبی کے ہیں۔ دوسرے کی رائے ہے کہ "نزدیک" کے معنی ہم مذہب کے ہیں اور "دُور" سے مطلب دوسرے مذہب والے ہیں، جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ۔ لیکن حقیقت میں یہ اختلاف بے معنی ہے۔ تعلیم محمدیؐ کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسایوں میں اُن کو ترجیح دی جائیگی جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائگی کے علاوہ محبت اور رابطے کا کوئی دوسرا تعلق بھی

موجود ہو۔ وہ خواہ قرابت اور عزیز داری ہو، یا ہم مذہبی ہو یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو۔ بہرحال حق کے ساتھ دوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے۔"

(سیرۃ النبیؐ، جلد ششم، صفحہ ۲۸۰)

اور "پہلو کے ساتھی" کے بارے میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا ارشاد ہے:

"متن میں "الصّاحب بالجنب" فرمایا گیا ہے۔ جس سے مراد ہم نشین دوست بھی ہے اور ایسا شخص بھی جس سے کہیں کسی وقت آدمی کا ساتھ ہو جائے۔ مثلاً آپ بازار میں جا رہے ہوں اور کوئی شخص آپ کے ساتھ راستہ چل رہا ہو، یا کسی دوکان پر آپ سودا خرید رہے ہوں اور کوئی دوسرا خریدار بھی آپ کے پاس بیٹھا ہو، یا سفر کے دوران کوئی شخص آپ کا ہمسفر ہو۔ یہ عارضی ہمسائگی بھی ہر مہذب اور شریف انسان پر ایک حق عائد کرتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حتی الامکان اُس کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اور اُسے تکلیف دینے سے مجتنب رہے۔" (تفہیم القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۳۵۲)

۳۔ ہمسائے کو ایذا دینے کی مذمّت

حضرت ابو شریح سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ عرض کیا گیا کہ کون یا رسولؐ اللہ! آپؐ نے فرمایا کہ وہ جس کا ہمسایہ اس کی ضرر رسانیوں سے مامون نہ ہو۔

(بخاری)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! فلاں عورت کی نماز، روزے اور خیرات کی کثرت کا بہت چرچا ہے مگر وہ اپنی زبان سے اپنے ہمسایوں کو اذیت دیتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ آگ میں جائے گی۔ اُس شخص نے کہا کہ یا رسولؐ اللہ! فلاں عورت کے بارے میں ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ کم روزے رکھتی ہے اور کم خیرات کرتی ہے اور کم نمازیں پڑھتی ہے۔ وہ (بس) پنیر کے ٹکڑے خیرات کرتی ہے مگر وہ اپنی زبان سے اپنے ہمسایوں کو دکھ نہیں دیتی۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ جنت میں جائے گی۔ (بیہقی)

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ آدمی جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے ہمسائے اس کی شرارتوں اور ایذا رسانیوں سے مامون نہ ہوں۔ (مسلم)

حضرت ابن مسعودؓ نے حضورؐ کے بارے میں ایک روایت بیان کی ہوئی ہے جس میں حضورؐ نے بیان فرمایا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے درمیان اخلاق کو بھی اسی طرح تقسیم کیا ہوا ہے جس طرح رزق کو۔ اس روایت کے آخر میں حضورؐ فرماتے ہیں:

"...... اُس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ بندہ اس وقت تک مسلمان نہیں بن سکتا جب تک اس کا دل اور اس کی زبان مسلمان نہ ہو اور (کوئی شخص) اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہمسایہ اس کی شرارتوں اور ایذا رسانیوں سے امن میں نہ ہو۔" (بیہقی)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی ہمسایہ اپنے ہمسائے کو اپنی دیوار میں لکڑی گاڑنے سے نہ روکے۔ پھر حضرت ابوہریرہؓ (لوگوں کو مخاطب کر کے) فرماتے تھے کہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں اس حدیث سے روگردانی کرنے والا پاتا ہوں۔ خدا کی قسم! میں اس حدیث کو تمہارے دونوں شانوں کے درمیان پھینکوں گا۔ (یعنی میں اسے برابر تمہارے سامنے بیان کرتا رہوں گا)۔ (بخاری)

حضرت عقبہ بن عامرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے دو شخص، جو آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے، دو ہمسائے ہوں گے۔

(رواہ احمد)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے ہمسائے کی شکایت کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جا اور صبر کر۔ وہ شخص پھر دو مرتبہ یا تین مرتبہ آیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ جا اور اپنا سامان راستے میں ڈال دے، چنانچہ اس نے اپنا سامان راستے میں ڈال دیا (گویا وہ اس گھر کو چھوڑ کر جا رہا تھا) لوگ اس سے (اس کا سبب) پوچھنے لگے تو وہ انہیں اپنی بات بتانے لگا (کہ اس طرح ہمسائے نے

تنگ کر رکھا ہے) اس پر لوگ اس کے ہمسائے کو لعن طعن کرنے لگے (اور بد دعا دینے لگے) کہ خدا اُسے ایسا کرے اور ایسا کرے۔ پھر اُس کا ہمسایہ اس کے پاس آیا اور اُس سے کہا کہ (چل گھر) واپس لوٹ جا (اب) تُو مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں دیکھے گا جو تجھے ناپسند ہو۔ (ابوداؤد)

غلام اور خادم کے حقوق

انسان چونکہ مالی لحاظ سے ایک درجے پر نہیں ہوتے، اس لئے روزی کمانے کے جو مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں، اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ غریب انسان کسی نسبتاً خوشحال شخص کی خدمت کر کے اُس خدمت کے عوض اس سے مال یا ضروریاتِ زندگی حاصل کرے۔ ان خدمت گزاروں کی بھی دو قسمیں رہی ہیں: ایک وہ جو دوسروں کی ملکیت ہوتے تھے، مثلاً: غلام اور کنیزیں اور دوسرے وہ جو ہوتے تو آزاد ہی ہیں مگر دوسروں کی خدمت کر کے اپنی روزی کماتے ہیں۔ اسلام میں ان دونوں اقسام کے خدمت گزاروں کے حقوق قائم کئے گئے ہیں جنہیں ادا کرنا ضروری ہے۔ اُن حقوق کا خلاصہ یہ ہے :۔

۱۔ خادم سے اتنا زیادہ کام نہ لیا جائے جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔

۲۔ خادم کی تنخواہ یا کھانا، کپڑا یا دوسری شرائطِ ملازمت کو دیانتداری سے پورا کیا جائے اور اس سے انصاف کیا جائے۔

۳۔ خادم کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے۔

۴۔ خادم کی خطاؤں کو معاف کیا جائے۔

۵۔ خادم پر ناروا اور ناجائز سختی کرنے سے پرہیز کیا جائے۔

۱۔ طاقت کے مطابق کام لینا

معرور بن سوید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ذرؓ کو دیکھا کہ آپ ایک جوڑا پہنے ہوئے

تھے اور آپ کے غلام نے بھی ویسا ہی جوڑا پہنا ہوا تھا۔ میں نے آپؓ سے اس کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک شخص کو (جو غلام تھا) گالی دی اور اُسے اس کی ماں سے عار دلائی۔ وہ شخص رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضورؐ کو یہ بات بتائی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ (اے ابوذرؓ) تو ایک ایسا شخص ہے جس میں (ابھی) جاہلیت (کا اثر باقی) ہے (یہ غلام) تمہارے بھائی ہیں اور تمہارے مملوک ہیں۔ اللہ نے انہیں تمہارے زیر دست کر دیا ہے۔ پس جس شخص کا بھائی اس کے زیرِ دست ہو اُسے چاہیئے کہ جو خود کھائے وہی اُسے کھلائے اور جو خود پہنے وہی اُسے پہنائے اور تم لوگ انہیں ایسے کاموں پر مجبور نہ کرو جو اُن پر شاق ہوں اور اگر تمہیں انہیں کسی ایسے کام پر مجبور کرنا ہی پڑے تو پھر اس کام میں خود اُن کی امداد کرو۔ (مسلم)

امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطّاب ہر ہفتے کے دن مدینے کے آس پاس گاؤں میں جایا کرتے تھے اور جب کسی غلام کو کوئی ایسا کام کرتے دیکھتے جو اس کی طاقت سے زیادہ ہوتا، تو اُسے کم کر دیتے۔ (مؤطّا)

ایک مرتبہ کوئی شخص حضرت سلمان فارسیؓ کو ملنے آیا اور دیکھا کہ آپ بیٹھے آٹا گوندھ رہے ہیں۔ اُس شخص نے حیران ہو کر پوچھا کہ آج آپ کا غلام کہاں ہے جو خود آٹا گوندھ رہے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ غلام کو میں نے کسی کام کے لئے باہر بھیجا ہے اس لئے میں اس کا کام کر رہا ہوں تاکہ غلام کو دو کام نہ کرنے پڑیں۔

۲۔ انصاف کرنا

اسلام میں غلام کی جان اور عزت کو اسی طرح محترم قرار دیا گیا ہے جیسے آزاد کی جان اور عزت کو، اور اسی طرح اسے معاشرے میں شہادت دینے اور امان دینے کا حق بھی حاصل ہے۔

حضرت سمرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم اُسے قتل کر دیں گے اور جس نے اپنے غلام کا کوئی عضو کاٹا ہم

اس کا عضو کاٹ دیں گے۔ (نسائی)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنے غلام پر تہمت لگائی، درآنحالیکہ وہ اس کے لگائے ہوئے عیب سے بری تھا خدا قیامت کے دن اس پر حد جاری فرمائے گا، سوائے اس کے کہ جو اس نے کہا ہو وہ ویسا ہی ہو۔ (ترمذی)

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ غلام کی شہادت جائز ہے، بشرطیکہ غلام عادل ہو۔ ایسے ہی امام سیرینؒ بھی غلام کی شہادت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ شہادت اس غلام کے آقا کے حق میں نہ ہو۔ (بخاری)

حضرت اُمّ ہانیؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے اپنے شوہر کے دو رشتہ داروں کو پناہ دی تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو تو نے پناہ دی اس کو ہم نے (بھی) پناہ دی۔ اہلِ علم کا اسی پر عمل ہے کہ وہ عورت کی پناہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ایسے ہی احمد اور اسحٰق نے بھی عورت اور غلام کی پناہ کو جائز قرار دیا ہے۔ حضرت عمرؓ بن خطاب کے بارے میں (بھی) بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے غلام کے کسی کو پناہ دینے کو جائز قرار دیا۔ (ترمذی)

اسلام سے پہلے غلاموں پر بہت ظلم کیا جاتا تھا، انھیں مارا پیٹا جاتا اور سخت قسم کی جسمانی سزائیں دی جاتیں اور پھر اس ظلم کو گناہ بھی نہ سمجھا جاتا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے واضح فرما دیا کہ غلام پر ظلم کرنا بھی ویسا ہی گناہ ہے جیسے آزاد پر ظلم کرنا اور اس ظلم کی دنیا میں بھی سزا ہے اور آخرت میں بھی۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے ایک کنیز کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا۔ (اس کنیز سے) پوچھا گیا کہ تیرے ساتھ یہ (ظلم) کس نے کیا۔ کیا فلاں نے کیا۔ کیا فلاں نے کیا؟ (اس طرح مختلف لوگوں کے نام لیے گئے) یہاں تک کہ اس یہودی کا نام لیا گیا (کہ کیا اُس نے یہ ظلم کیا) تو اُس (کنیز) نے اپنے سر سے اشارہ کیا (کہ ہاں) اس پر وہ یہودی پکڑا گیا تو اس نے (اپنے جرم کا) اعتراف کر لیا۔ پس حضورؐ نے اس کے بارے میں حکم دیا تو اُس کا سر بھی دو پتھروں کے درمیان کچل دیا گیا۔ (بخاری)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنے غلام کو ظلماً مارا اس سے قیامت کے دن بدلہ لیا جائے گا۔ (بیہقی)

حضورؐ کی تعلیمات کا مسلمانوں پر یہ اثر تھا کہ:

معاویہ بن سویدؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک غلام کو طمانچہ مارا۔ پھر میں بھاگ گیا۔ پھر ظہر سے کچھ پہلے آیا اور اپنے باپ کے پیچھے (ظہر کی) نماز پڑھی۔ پھر میرے باپ نے اس غلام کو بھی بلایا اور مجھے بھی۔ اور اس سے فرمایا کہ اس سے بدلہ لے لے، مگر غلام نے مجھے معاف کر دیا۔ (اور میں بدلے سے بچ گیا) ..... (مسلم)

انہیں حضرت سویدؓ کا واقعہ ہے کہ کسی شخص نے اُن کی ایک کنیز کو طمانچہ مار دیا۔ ابن حضرت سویدؓ نے فرمایا کہ کیا تو جانتا نہیں کہ چہرے پر مارنا حرام ہے اور فرمایا کہ رسولِ خدا کے عہد میں میں اپنے بھائیوں میں سے ساتواں تھا اور ہمارے پاس صرف ایک خادم تھا۔ ہم میں سے کسی نے اُسے طمانچہ مار دیا تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اُسے آزاد کر دیں۔ (مسلم)

صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے بارے میں بھی ایک روایت بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے اپنے ایک غلام کو بُلایا اور اس کی پشت پر ایک نشان دیکھا اور فرمایا کہ میں نے تجھے تکلیف دی۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ (جاؤ) تم آزاد ہو۔ پھر آپؓ نے زمین سے کوئی چیز اُٹھائی اور فرمایا کہ اسے آزاد کرنے میں مجھے اس شے کے برابر بھی ثواب نہیں ملا۔ کیونکہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا ہے کہ جس نے اپنے غلام کو ناحق حد لگائی یا اُسے طمانچہ مارا تو اُس کا کفّارہ یہ ہے کہ اُسے آزاد کر دے۔ (مسلم)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک شخص رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! میرے کچھ غلام ہیں، وہ مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں اور میرے ساتھ خیانت کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرتے ہیں اور میں انھیں گالیاں دیتا ہوں اور انھیں مارتا ہوں تو (آپؐ مجھے بتائیے کہ) اُن کے سبب میرا کیا حال ہوگا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ جو کچھ تمہارے ساتھ خیانت کرتے ہیں اور تمہارے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں

اور تمہاری نافرمانی کرتے ہیں، اس کا (بھی) حساب ہوگا اور تم انہیں جو سزا دیتے ہو (اس کا بھی ہوگا، پھر) اگر وہ سزا جو تم انہیں دیتے ہو، اُن کے گناہوں کے برابر ہی ہوئی تو حساب بیباق ہو جائے گا، نہ تمہیں ثواب ملے گا نہ عذاب۔ اور اگر وہ جو سزا تم انہیں دیتے ہو اُن کے گناہوں سے کم ہوئی تو اُن کے گناہ تمہاری سزا سے جتنے زیادہ ہوں گے (ان کے حساب سے) تمہیں اتنا ثواب مل جائے گا اور اگر وہ سزا جو تم انہیں دیتے ہو اُن کے گناہوں سے زیادہ ہوئی تو جتنی تمہاری سزا زیادہ ہوگی (اس کے حساب سے) اُنہیں تم سے قصاص دلایا جائے گا (حدیث کا راوی) بیان کرتا ہے کہ پھر وہ شخص ایک گوشے میں چلا گیا اور رونے چلانے لگا۔ (اس پر) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اللہ کی کتاب (میں یہ آیت) نہیں پڑھتے۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا الآية (قیامت کے دن ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دینگے۔ پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا جس کا رائی کے دانے کے برابر بھی کچھ دھرا ہوگا وہ ہم سامنے لے آئیں گے اور حساب لگانے کے لئے ہم کافی ہیں) پھر وہ شخص کہنے لگا کہ یارسول اللہ! خدا کی قسم، میں اپنے لیے اور ان کے لئے اس سے بہتر کچھ نہیں پاتا کہ ان سے جُدائی اختیار کر لوں۔ میں آپؐ کو گواہ بناتا ہوں کہ یہ سب کے سب آزاد ہیں۔

(ترمذی)

۳۔ معاف کرنا

ہر انسان بتقاضائے بشریت غلطی کر سکتا ہے اور غلام اور خادم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے کہ ان کی غلطیوں کو زیادہ سے زیادہ بار معاف کیا جائے اور اُن کے معاملے میں درگذر سے کام لیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں خادم (کے قصور) کو کتنی بار معاف کیا کروں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ اس نے پھر عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں خادم

(کے قصور) کو کتنی بار معاف کیا کروں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہر روز ستّر مرتبہ۔ (ترمذی)

ظاہر ہے کہ اگر ہر روز انسان اپنے خادم کے قصور کو اتنی بار معاف کرے گا تو اِس بات کا امکان کم ہی ہے کہ کبھی خادم کو سزا دینے کی نوبت آئے۔ حضورؐ کے فرمان کا جو اصل مقصد تھا وہ یہی ہے کہ خدمت گار کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ نرمی کا رویہ اختیار کیا جائے اور اُسے سزا دینے سے حتی الامکان اجتناب کیا جائے۔

۴۔ حسنِ سلوک

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو آپؐ کے پاس کوئی خادم نہ تھا۔ پس (میرے سوتیلے والد) ابوطلحہؓ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے آپؐ کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! انسؓ ایک عقلمند لڑکا ہے۔ یہ آپؐ کی خدمت کرے گا۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ پھر میں نے سفر اور حضر میں آپؐ کی خدمت کی (اور اس تمام مدت میں) اگر میں نے کوئی کام کیا تو آپؐ نے اُس کے بارے میں مجھے کبھی یہ نہ فرمایا کہ یہ کام تُو نے ایسے کیوں کیا اور (ایسے ہی) اگر میں نے کوئی کام نہ کیا تو آپؐ نے اُس کے بارے میں کبھی یہ نہ فرمایا کہ یہ کام تو نے ایسے کیوں نہیں کیا۔ (بخاری)

حضرت انسؓ ہی کا بیان ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ خوش خلق تھے۔ ایک دن آپؐ نے مجھے کسی کام کے لئے بھیجنا چاہا تو میں نے کہا کہ خدا کی قسم میں نہیں جاؤں گا مگر میرے دل میں یہ تھا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے جس بات کا حکم دیا ہے اس کے لئے میں (ضرور) جاؤں گا۔ غرض کہ میں چل دیا۔ یہاں تک کہ میں کچھ بچوں کے پاس سے گزرا جو بازار میں کھیل رہے تھے۔ اچانک حضورؐ نے پیچھے سے میری گُدّی کو پکڑ لیا۔ میں نے آپؐ کی طرف دیکھا تو آپؐ ہنس رہے تھے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اے انس! کیا تُو وہاں گیا جہاں جانے کا میں نے تجھے حکم دیا تھا۔ میں نے عرض کیا۔ جی ہاں یا رسول اللہؐ، میں جا ہی رہا ہوں۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ خدا کی قسم! میں نے حضورؐ کی نو سال خدمت کی۔ مجھے علم نہیں کہ میں نے کوئی کام کیا ہو اور حضورؐ نے اس کے بارے میں

فرمایا ہو کہ تُو نے ایسا اور ایسا کیوں کیا، یا میں نے کوئی کام چھوڑ دیا ہو اور حضورؐ نے اس کے بارے میں فرمایا ہو کہ تُو نے ایسے اور ایسے کیوں نہیں کیا۔ (مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا خادم (اس کے لئے کھانا تیار کر کے لائے اور اس طرح) اُسے اپنا کھانا (خود) تیار کرنے اور (تیار کرتے ہوئے) گرمی اور دھوئیں کی تکلیف اُٹھانے سے بچالے تو اُس (مالک) کو چاہیئے کہ خادم کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے ساتھ (کھانے پر) بٹھالے۔ پھر اگر اُسے (یعنی مالک کو ایسا کرنے سے) انکار ہو (یا خادم تواضع کے باعث مالک کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کر دے) تو (مالک) کو چاہیئے کہ ایک لقمہ ہی لے کر اُسے کھلا دے۔ (ترمذی)

رافع بن مکیث بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا (باعث) برکت ہے اور بدخلقی (باعث) نحوست ہے۔ (ابوداوٗد)

۵۔ سختی کرنے کی ممانعت

حضرت ابومسعود انصاریؓ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے ایک غلام کو مار رہا تھا کہ میں نے اپنے پیچھے سے ایک آواز سُنی کہ اے ابومسعودؓ جان لے کہ جتنی قدرت تجھے اس غلام پر حاصل ہے خدا کو اس سے زیادہ قدرت تجھ پر حاصل ہے۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ میں نے عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ! یہ اللہ تعالیٰ کے لئے آزاد ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اگر تو ایسا نہ کرتا تو (جہنم کی) آگ تجھے جلا دیتی یا (آپؐ نے یوں فرمایا کہ جہنم کی) آگ تجھے چھُو لیتی۔ (مسلم)

حضرت ابوبکر صدیقؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے غلاموں اور کنیزوں سے بُرا سلوک کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابواُمامہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو ایک غلام دیا اور فرمایا کہ اسے مارنا مت، کیونکہ مجھے نمازیوں کو مارنے سے منع کیا گیا ہے

اور میں نے اسے نماز پڑھتے دیکھا تھا...... (اس مضمون کی ایک اور روایت بیان ہوئی ہے کہ) حضرت عمرؓ بن خطاب نے فرمایا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس بات سے منع فرمایا کہ ہم نمازیوں کو ماریں۔ (مشکوٰۃ)

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین صفات ایسی ہیں کہ جس میں ہوں گی خدا اس کی موت آسان کر دے گا اور اُسے جنّت میں داخل کرے گا: (ایک) کمزور کے ساتھ نرمی کرنا (دوسرے) والدین کے ساتھ شفقت کا سلوک کرنا، اور (تیسرے) اپنے غلاموں اور کنیزوں سے حسنِ سلوک سے پیش آنا۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے غلاموں اور کنیزوں میں سے جو تمہارے مزاج کے موافق ہوں تو انہیں کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور انہیں پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو اور اُن میں سے جو تمہارے مزاج کے موافق نہ ہو اُسے بیچ دو اور اللہ کی مخلوق پر عذاب نہ کرو۔ (ابوداؤد)

کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ ماں اور بچہ یا دو بھائی کسی ایک شخص کی ملکیت میں ہوتے۔ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بیچ دیتا اور وہ کسی اور مالک کے پاس چلا جاتا تو اس طرح ماں اور بچّے اور بھائی اور بھائی کے درمیان جُدائی ہو جاتی۔ حضورؐ نے اسے سخت ناپسند فرمایا۔

حضرت ابوایوبؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ جس نے ماں اور بچّے کے درمیان جُدائی ڈالی خدا قیامت کے دن اُس کے اور اس کے محبوبوں کے درمیان جُدائی ڈال دے گا۔ (ترمذی)

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دو غلام عطا کیے جو آپس میں بھائی تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو بیچ دیا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اے علیؓ! تیرا (ایک) غلام کیا ہوا؟ میں نے آپؐ کو اطلاع دی (کہ میں نے اُسے بیچ دیا ہے) تو آپؐ نے فرمایا کہ اُسے واپس لے لے، اُسے واپس لے لے۔

(ترمذی)

۶۔ غلام آزاد کرنے کی فضیلت

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی مسلمان (غلام) کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اس (غلام) کے ہر عضو کے بدلے آزاد کرنے والے کے عضو کو آگ سے نجات دے گا۔ (امام زین العابدین علی بن حسینؓ کے ایک مصاحب) سعید بن مرجانہ بیان کرتے ہیں کہ میں (امام) علی بن حسینؓ کے پاس گیا (اور اُن سے یہ حدیث بیان کی) تو انھوں نے اپنے ایک غلام کا قصد کیا (جو اتنا قیمتی تھا کہ) عبداللہ بن جعفرؓ اس کے لئے دس ہزار درہم یا ایک ہزار دینار دینے کو تیار تھے، مگر امام علیؓ بن حسینؓ نے (یہ حدیث سن کر) اُسے آزاد کر دیا۔ (بخاری)

ابوموسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے پاس کوئی کنیز ہو پھر وہ اس کی پرورش کرے اور اس سے حسنِ سلوک کرے، پھر اُسے آزاد کر کے اس سے شادی کر لے تو اس کو دُہرا ثواب ہوگا۔ (بخاری)

غلام کو آزاد کرنے کو بہت بڑا ثواب قرار دے کر اسلام میں اس بات کا بندوبست فرمایا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اپنی آزادی حاصل کر لیں، بعض گناہوں کا کفّارہ یہ رکھا گیا ہے کہ غلام آزاد کیا جائے، مثلاً:

"... جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا دے۔"

(سورۃ النساء، آیت ۹۲)

ایسے ہی خاص خاص مواقع پر بھی غلام آزاد کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ مثلاً:

حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ بیان کرتی ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج گرہن میں غلام آزاد کرنے کا حکم فرمایا۔ (بخاری)

میتوں کو ثواب پہنچانے کی خاطر بھی غلام آزاد کیے جاتے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی عمرہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ اُن کی والدہ نے غلام آزاد

کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر اس کام میں دیر لگائی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور وہ وفات پا گئیں۔
حضرت عبدالرحمنؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد سے کہا کہ اگر میں اپنی والدہ کی طرف سے غلام آزاد کردوں تو کیا یہ بات انہیں نفع پہنچائے گی۔ اس پر قاسم بن محمد نے کہا کہ حضرت سعدؓ بن عُبادہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور عرض کیا تھا کہ میری ماں وفات پا گئی ہیں تو کیا یہ بات انہیں فائدہ دے گی کہ میں اُن کی طرف غلام آزاد کروں، تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ہاں۔ (مشکوٰۃ)

یحییٰ بن سعید بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمنؓ بن ابی بکرؓ سوتے ہوئے وفات پا گئے تو اُن کی ہمشیرہ حضرت عائشہؓ نے اُن کی طرف سے بہت غلام آزاد کیے۔ (مشکوٰۃ)

۷۔ غلاموں کا رتبہ

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے سامنے وہ تین شخص پیش کیے گئے جو بہشت میں سب سے پہلے داخل ہونے والے تھے، (ان میں ایک) شہید (تھا، دوسرا) وہ پاک دامن جو حرام و شبہات سے بچتا ہے اور (تیسرا) وہ غلام جس نے اچھی طرح اللہ کی بندگی کی اور اپنے مالکوں کی خیر خواہی کی۔
(ترمذی)

اسلام میں نماز کی امامت کرانا بڑے اعزاز کی بات ہے اور یہ اعزاز اُن لوگوں کو بھی حاصل رہا ہے جو غلامی کے دَور میں سے گزر چکے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بتایا کہ حضرت ابو حُذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالم مسجد قبار میں مہاجرین اوّلین اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی امامت کیا کرتے تھے حالانکہ اُن میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابو سلمہؓ، حضرت زیدؓ اور حضرت عامرؓ بن ربیعہ (جیسے لوگ) موجود ہوتے تھے۔ (بخاری)

علمائے اسلام میں ایک لمبی لسٹ اُن بزرگوں کی ہے جو غلام رہ چکے تھے۔ اُن میں سے چند نام درج ذیل ہیں :۔

امام حسن بصریؒ ـــــ آپ علمی لحاظ سے علماء کے سرخیل اور روحانی اور اخلاقی لحاظ سے اولیاء کے سرتاج تھے۔ آپ کے والدین بھی غلام تھے۔ آپ کی والدہ ام المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ کی کنیز تھیں۔ لہٰذا آپ حضرت سلمہؓ کے سایۂ عاطفت میں پلے۔ دوسری ازواجِ مطہرات کے گھروں میں بھی آپ کی آمد و رفت رہی۔ علامہ ابن سعدؒ آپ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "حسنؒ جامع کمالات تھے، عالم تھے، بلند مرتبہ تھے، رفیع الشان تھے، فقیہہ تھے، مامون تھے، عابد و زاہد تھے، وسیع العلم تھے، فصیح و بلیغ تھے اور حسین و جمیل تھے۔"

مشہور تابعی عالم حضرت عکرمہؓ جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے غلام تھے۔ آپ تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ میں امامت کا مقام رکھتے تھے۔ مشہور محدّث ابن سعدؒ نے آپ کو "علم کا سمندر" قرار دیا اور امام بخاریؒ نے آپ کو حجّت اور سند مانا۔

حضرت سعیدؒ بن جبیر ـــــ غلامی سے اُٹھ کر آخر آپ اقلیم علم کے تاجدار بن گئے۔ میمون بن مہران فرماتے ہیں کہ سعیدؒ نے ایسے وقت میں انتقال کیا کہ روئے زمین پر کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ان کے علم کا محتاج نہ رہا ہو۔

حضرت عطاء بن ابی رباح ـــــ فضل و کمال اور زہد و ورع کے لحاظ سے بڑے جلیل القدر تابعی تھے۔ امام اوزاعیؒ اُن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ عطاء نے جس وقت انتقال کیا اس وقت وہ لوگوں میں روئے زمین کے سب سے زیادہ پسندیدہ آدمی تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ "اگر علم کسی کے ساتھ مخصوص ہوتا تو عالی نسب اس کے زیادہ حقدار تھے لیکن عطاء حبشی غلام تھے، یزید بن حبیب نوبی اور حسن بصریؒ اور ابن سیرین غلام تھے۔"

حضرت ابو العالیہ ریاحی ـــــ آپ قبیلہ بنی ریاح کی ایک عورت کے غلام تھے۔ اپنی آزادی کا حال اس طرح بتاتے ہیں۔ "میں ایک عورت کا غلام تھا۔ جب اس نے مجھے آزاد کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے چچیرے بھائیوں نے روکا . . . . مگر وہ مجھے آزاد کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی . . . . ایک جمعہ وہ میرے پاس آئی اور مجھ سے پوچھ کر جامع مسجد کی طرف چلی، میں بھی ساتھ ہو لیا۔ مسجد میں پہنچنے کے بعد امام نے ہمیں منبر پر کھڑا کر دیا۔ عورت نے میرا

ہاتھ پکڑ کر ان الفاظ میں میری آزادی کا اعلان کیا ــــ خدایا، میں تیرے پاس اس کو (آخرت کے لئے) جمع کرتی ہوں، مسجد والو! گواہ رہنا یہ غلام خدا کے لئے آزاد ہے۔ آئندہ حق معروف کے علاوہ اس پر کسی کا کوئی حق نہیں۔ یہ کہہ کر وہ مجھے آزاد چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے بعد پھر وہ نہیں دکھائی دی۔"

حضرت ابوالعالیہؒ کے علمی کمالات کی وجہ سے بڑے بڑے صحابہؓ ان کی عظمت کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اُن کی اتنی عزت کرتے تھے کہ ابوالعالیہؒ جب اُن کے پاس جاتے تو ابن عباسؓ اُن کو اونچے مقام پر بٹھاتے اور معززینِ قریش اُن سے نیچے ہوتے۔ اس اعزاز کے ساتھ بٹھانے کے بعد فرماتے کہ "علم اسی طرح شریف کے شرف میں اضافہ کرتا ہے اور مملوک کو تخت پر بٹھاتا ہے۔"

یہ چند مثالیں ہیں۔ اس آسمان پر تو ان گنت درخشاں ستارے ہیں جن سے ایک عالم نے روشنی حاصل کی اور جنہوں نے لفظ "غلامی" ہی کو چار چاند لگا دیے!۔

یتیم اور بیوہ کے حقوق

جس بچّے کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ جائے، وہ شریعت کی اصطلاح میں "یتیم" ہے۔ اور چونکہ یتیم کی حفاظت کرنے والا، اس کی ضروریات پوری کرنے والا اور اُسے کما کر کھلانے والا موجود نہیں ہوتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُس کے خاص حقوق قائم کر رکھے ہیں تاکہ اس کی زندگی میں جو محرومی آگئی ہے اس کی تلافی ہو سکے۔

کلامِ پاک اور احادیثِ نبویہؐ کی روشنی میں یتیم ایک ایسی ہستی ہے جس کی کفالت کرنیوالے نگرانی کرنے والے اور اس سے حسنِ سلوک کرنے والے کو بے پناہ اجر کی بشارت دی گئی ہے۔ یتیم غریب بھی ہو سکتا ہے اور امیر بھی، مگر دونوں طرح کے یتیموں کی نگرانی کرنے یا اُن سے حسنِ سلوک کرنے کو بہت بڑا ثواب قرار دیا گیا ہے اور یتیم کے نگراں کو خاص ہدایات دی گئی ہیں کہ وہ اس کے بارے میں ایسا رویہ اختیار کرے جس میں یتیم کا فائدہ ہو۔

امیر یتیم کے نگراں کی ایک تو یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس یتیم کی حفاظت کرے اور اس کے کاموں کا بندوبست کرے اور دوسرے اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یتیم کے مال کی بھی حفاظت کرے تاکہ اس کے بڑے ہونے تک وہ مال ختم ہی نہ ہو جائے۔ امیر یتیم کے نگراں کو تنبیہہ فرمائی گئی ہے کہ وہ یتیم کے مال کو خیانت سے غصب نہ کرے ورنہ وہ بہت بڑے عذاب کا مستحق ہوگا۔ اگر نگراں خود صاحبِ حیثیت ہے تو اُسے یتیم کے مال میں سے کچھ بھی نہیں لینا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ غریب محتاج ہے تو اسے شریعت کی طرف سے اجازت ہے کہ یتیم کی نگرانی کرنے کے عوض اُس کے مال سے مناسب عوضانہ لے لے۔

یتیم کے ساتھ حسنِ سلوک کو اتنی بڑی نیکی سمجھا گیا ہے کہ بیوہ ماں اگر خود اپنے ہی یتیم بچوں پر خرچ کرے اور ان سے حسنِ سلوک اور خیر خواہی کرے تو وہ بھی ثواب کی حقدار ہو گی۔ ذیل کی آیات و احادیث میں ان سب ہدایات کی توضیح فرما دی گئی ہے :

۱۔ یتیم کی کفالت اور اس سے حسنِ سلوک کی تاکید اور فضیلت

سورۃ النساء آیت ۱۲۷ میں فرمایا گیا ہے :

وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلۡيَتٰمٰى بِالۡقِسۡطِ‌ؕ

"اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے بارے میں انصاف پر قائم رہو۔"

سورۃ الدھر، آیات ۷ اور ۸ میں ابرار یعنی نیکوکاروں کی صفات کی گئی ہیں کہ وہ

"۔۔۔۔ نذر پوری کرتے ہیں،

اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہو گی،

اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔"

حضرت سہلؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے، اور آپؐ نے انگشت شہادت اور درمیان والی انگلی سے اشارہ کیا اور ان کے درمیان کچھ کشادگی رکھی۔ (بخاری)

چونکہ یہ دونوں انگلیاں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اس لئے حضورؐ نے ان کے ساتھ اشارہ کر کے فرمایا کہ اس طرح میں اور یتیم کا کفیل بھی جنت میں ساتھ ساتھ ہونگے۔ جنت میں حضورؐ کا ساتھ حاصل ہونا حد درجے اعزاز کی بات ہو گی اور یہ اعزاز اس شخص کو بھی حاصل ہو جائے گا جس نے زندگی میں کسی یتیم کی کفالت کی ہو گی۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مسلمانوں میں سے کسی یتیم کو لے لیا اور اُسے اپنے کھانے اور پینے میں شریک کر لیا۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ ضرور بالضرور اُسے جنت میں داخل کرے گا، سوائے اس کے کہ اس نے کوئی ایسا جرم کیا ہو جو ناقابلِ معافی ہو۔

حضرت ابو اُمامہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا (اور) صرف خدا کی خوشنودی حاصل کرنے ہی کے لیے پھیرا تو سر کے جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ پھرا، ہر ہر بال کے بدلے اُسے نیکیاں ملیں گی اور جس نے اپنے پاس رہنے والی کسی یتیم بچّی یا یتیم بچّے سے حسنِ سلوک کیا تو میں اور وہ جنت میں ان دو (انگلیوں) کی طرح (پاس پاس) ہوں گے اور آپؐ نے اپنی دو انگلیوں کو ملایا (کہ اس طرح پاس پاس)
(احمد، ترمذی)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اپنے دل کی سختی کی شکایت کی۔ حضورؐ نے (اسے دل کی سختی دُور کرنے کا علاج یہ) بتایا کہ یتیم کے سر پر (شفقت سے) ہاتھ پھیرا کر اور مسکین کو کھانا کھلایا کر۔
(رواہ احمد)

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے اپنے میاں حضرت ابوسلمہؓ سے بچّے تھے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر میں ابوسلمہؓ سے بچوں پر خرچ کروں تو کیا مجھے ثواب ملے گا۔ میں انھیں اس طرح (فقر کی حالت میں) چھوڑ نہیں سکتی کہ وہ میرے ہی بچّے ہیں۔ (اس پر) حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں، جو کچھ تو اُن پر خرچ کرے گی تجھے اس کا اجر ملے گا۔ (بخاری)

۲۔ یتیم کے مال کی حفاظت

سورۃ النساء آیت ۱۰ میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ۝	"جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ کو آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔"

"حدیث میں آیا ہے کہ جنگ اُحد کے بعد حضرت سعدؓ بن ربیع کی بیوی اپنی دو بچیوں کو لیے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ سعدؓ کی بچیاں ہیں جو آپؐ کے ساتھ اُحد میں شہید ہوئے ہیں۔ ان کے چچا نے پوری جائیداد

پر قبضہ کرلیا ہے اور ان کے لئے ایک حبّہ تک نہیں چھوڑا ہے، اب بھلا ان بچیوں سے کون نکاح کرے گا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔" (تفہیم القرآن، جلد اول، صفحہ ۳۲۵)

سورۃ النساء آیت ۲ میں ارشاد ہوا ہے:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ○

"یتیموں کے مال اُن کو واپس دو، اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو اور اُن کے مال اپنے مال کے ساتھ مِلا کر نہ کھاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"

یہاں یتیم کے مال کے بارے میں تین حکم دیے گئے ہیں:

۱۔ یتیم کو اس کا مال واپس دو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک یتیم نابالغ ہے اس کے مال کی حفاظت کرو اور اس کے مفاد پر صرف کرو۔ پھر جب یتیم سن رُشد کو پہنچ جائے تو.... دیانتداری سے اس کا مال اس کے حوالے کر دو۔

۲۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو۔ اس کی تشریح میں بتایا گیا ہے کہ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہو سکتا ہے کہ حلال کی کمائی کے بجائے حرام خوری نہ کرنے لگو اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یتیم کے اچھے مال کو خود لے کر اس کی جگہ بُرا مال نہ دو۔

۳۔ تیسری ہدایت یہ دی گئی ہے کہ اس کے مال کو اپنے مال میں ملا کر نہ کھاؤ۔ اس کی ایک صورت تو اس طرح ہو سکتی ہے کہ یتیم کا مال اور اپنا مال ملا کر خرچ کیا جائے مگر خرچ اس طرح کیا جائے کہ اپنا مال کم خرچ ہو اور اس کا زیادہ ہو جائے اور اس طرح یتیم کا نقصان ہو، یا پھر دوسری شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یتیم کے مال پر قبضہ کر کے اسے اپنے مال میں ملا لیا جائے اور اپنے صرف میں لایا جائے۔

یتیم کے مال میں خیانت کرنے کی ان سب شکلوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ایسا کرنا بہت بڑا گناہ ہے:

سورۃ الانعام آیت ۱۵۲ میں فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ

"اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سن رُشد کو پہنچ جائے۔"

یہاں بھی اس بات کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ یتیم کے مال کے معاملے میں ایسا طرزِ عمل اختیار کرو جو بے غرضی اور نیک نیتی پر مبنی ہو اور جو یتیم کے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ہو۔ اسی طرح اس کو نفع پہنچانے والا طریقہ اختیار کیے رکھو یہاں تک کہ یتیم اس قابل ہو جائے کہ اپنے مال کو خود سنبھال سکے۔

سورۃ النساء آیت ۶ میں حکم دیا گیا ہے:

وَلَا تَأْكُلُوهَآ إِسْرَافًا وَّبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا ۚ

"ایسا کبھی نہ کرنا کہ حدِ انصاف سے تجاوز کر کے اس خوف سے اُن کے مال جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔"

آیت اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ یتیموں کے سرپرستوں کو اس خیانت اور بددیانتی سے بچنا چاہیئے کہ یتیموں کے بڑا ہونے اور اپنے حق کا مطالبہ کرنے کے قابل ہونے سے پہلے پہلے ہی اُن کے مال کو کھا اُڑا کر ختم کر دیں۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات ہلاک کر دینے والی چیزوں سے بچو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! وہ کیا ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

۱۔ خدا کے ساتھ شرک کرنا،

۲۔ اور جادو،

۳۔ اور اس جان کو قتل کرنا جسے خدا نے محترم قرار دیا ہو سوائے اس کے کہ اسے حق سے قتل کیا جائے،

۴۔ اور سود کھانا،

۵۔ اور یتیم کا مال کھانا،

۶۔ اور کافروں کے مقابلے میں جنگ کرتے ہوئے پیٹھ دکھانا،

۷۔ اور پاکدامن، مومن، بھولی بھالی عورتوں پر تہمت لگانا۔

(بخاری، مسلم)

یہاں حضورؐ نے یتیم کا مال کھانے کو ان سات چیزوں میں شمار کیا ہے جو ہلاک

کردینے والی ہیں۔ یتیموں کے مال کے بارے میں عہدِ نبوی میں ایک مسئلہ اور پیدا ہوگیا تھا، وہ یہ کہ جب ایسے احکام نازل ہوتے شروع ہوئے کہ "یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو" اور یہ کہ "جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں۔" تو اس سے وہ لوگ جن کی تربیت میں یتیم بچے تھے، اس قدر خوفزدہ ہوگئے کہ انھوں نے اُن کا کھانا پینا تک اپنے سے الگ کردیا۔ صاحبِ مال یتیموں کے نگراں اُنہیں اُن کے مال سے کِھلاتے پلاتے تھے اور یوں بھی ہوتا تھا کہ اُن کا کھانا اور اپنا کھانا اکٹھا تیار کرلیا گیا اور اُس میں سے انھیں بھی کِھلادیا گیا اور خود بھی کھالیا۔ مگر اب نگراں ڈرنے لگے کہ کہیں کھانا پینا اکٹھا رکھنے سے یتیم کے مال کا کوئی چھوٹا موٹا حصّہ بھی ہمارے مال میں نہ مل جائے۔ اسی لئے انھوں نے اُن کا کھانا پینا علیٰحدہ کردیا اور حضورؐ سے پوچھا کہ یتیموں کے معاملے میں ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم نازل ہوا:

"(یہ لوگ) پوچھتے ہیں کہ یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہو جس طرزِ عمل میں ان کے لئے بھلائی ہو وہی اختیار کرنا بہتر ہے۔ اگر تم اپنا اور اُن کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، آخر وہ تمہارے بھائی بند ہی تو ہیں، بُرائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔ اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا مگر وہ بااختیار ہونے کے ساتھ ہی دانا بھی ہے۔" (سورۃ البقرہ، آیت ۲۲۰)

ظاہر ہے کہ خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھنے میں نگرانوں کے لئے زیادہ آسانی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ دیانتداری سے کام لیا جائے۔ اصل شے یہ ہے کہ یتیموں کے مال کی حفاظت کی جائے اور اسے ایک مقدس امانت سمجھ کر اس کے معاملے میں پوری پوری خداترسی اور خیرخواہی سے کام لیا جائے۔ اگر اس بات کا دھیان رکھا گیا تو ملا کر خرچ کرلینے میں کوئی حرج نہیں۔

اس کے علاوہ یتیموں کے معاملے میں ایک اور سہولت دی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اگر یتیموں کا نگراں کوئی مفلس آدمی ہے تو کوئی حرج نہیں اگر وہ یتیموں کی نگرانی کرنے کی مناسب

اُجرت لے لے۔ یہ اجرت یتیم کے مال ہی سے لی جائے گی اور اس کے معاملے میں بھی یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ "مناسب" ہو اتنی زیادہ نہ ہو کہ یتیم کو مالی نقصان پہنچے۔ اور پھر جو کچھ وہ لے چوری چھپے نہ لے، علانیہ لے اور اس کا حساب رکھے، لیکن اگر یتیموں کا نگراں صاحبِ حیثیت آدمی ہے تو اسے یہ کارِ خیر محض خدا کی رضا کے لئے کرنا چاہیئے اور اُس کی اجرت نہیں لینی چاہیئے۔

سورۃ النساء آیت ۶ میں اس کے متعلق یوں فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ	"(یتیم کا) جو (سرپرست) مالدار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقے سے کھائے۔"

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ (والی آیت) یتیم کے سرپرست کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اس کی نگرانی کرتا ہے اور اس کے مال کی دیکھ بھال کرتا ہے، اگر وہ فقیر ہو تو دستور کے موافق یتیم کے مال میں سے کھالے۔ (بخاری)

پھر جب یتیم سن رُشد کو پہنچ جائے اور اپنے مال کو خود سنبھالنے کے قابل ہو جائے تو پھر نگراں کا کام ختم ہو گیا۔ اب اُسے چاہیئے کہ دیانتداری سے یتیم کا مال اس کے حوالے کردے۔ سورۃ النساء آیت ۶ میں اس کے بارے میں یوں ہدایت دی گئی ہے:

وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ	"اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں، پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو اُن کے مال ان کے حوالے کردو۔"

"یعنی جب وہ سنِ بلوغ کے قریب پہنچ رہے ہوں تو دیکھتے رہو کہ اُن کا عقلی نشوونما کیسا ہے اور اُن میں اپنے معاملات کو خود اپنی ذمہ داری پر چلانے کی صلاحیت کس حد تک پیدا ہو رہی ہے، مال اُن کے حوالے کرنے کے لئے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں: ایک بلوغ دوسرے رشد یعنی مال کے صحیح استعمال کی اہلیت پہلی شرط کے متعلق تو فقہائے اُمت میں

اتفاق ہے (کہ یتیم کے مال کا اس کے حوالے کیے جانے کے لئے اس کا بالغ ہونا ضروری ہے) دوسری شرط کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر سن بلوغ کو پہنچنے پر یتیم میں رُشد نہ پایا جائے تو یتیم کے ولی (یعنی نگراں) کو زیادہ سے زیادہ سات سال اور انتظار کرنا چاہیئے۔ پھر خواہ رُشد پایا جائے یا نہ پایا جائے، اُس کا مال اُس کے حوالے کر دینا چاہیئے، اور امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ مال کے حوالے کیے جانے کے لئے بہرحال رُشد کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ غالباً موخرالذکر حضرات کی رائے کے مطابق یہ بات زیادہ قرینِ صواب ہوگی کہ اس معاملے میں قاضیٔ شرع سے رجوع کیا جائے اور اگر قاضی پر ثابت ہو جائے کہ اس میں رُشد نہیں پایا جاتا تو وہ اس کے معاملات کی نگرانی کے لئے خود کوئی مناسب انتظام کر دے۔"

(تفہیم القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۳۲۳)

قرآن پاک نے یہ بھی ہدایت دی ہے کہ یتیم کا مال اُس کے حوالے کیا جائے تو اس پر گواہ بنا لئے جائیں۔

سورۃ النساء آیت ۶ ہی میں فرمایا گیا ہے کہ:

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ○

"پھر جب اُن کے مال اُن کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنا لو اور حساب لینے کے لئے اللہ کافی ہے۔"

اس طرح اللہ تعالیٰ یتیم کے معاملے میں ہر طرح کی احتیاط سکھاتا ہے تاکہ نہ یتیم کو کوئی نقصان پہنچے اور نہ اس کے سرپرست کو۔

۳۔ ... یتیم سے بدسلوکی کرنے کی ممانعت

سورۃ الضحیٰ، آیت ۹ میں فرمایا گیا ہے:

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝

"لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو۔"

سورۃ الماعون میں آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلانے والے شخص کی ایک صفت یہ بھی

بیان کی گئی ہے کہ وہ

یَدُعُّ الْیَتِیْمَ۔ "یتیم کو دھکّے دیتا ہے۔"

تفہیم القرآن جلد ششم میں اس "یَدُعُّ الْیَتِیْمَ" کی تشریح کرتے ہوئے بیان ہوا ہے:

"یَدُعُّ الْیَتِیْمَ کے کئی معنی ہیں: ایک یہ کہ وہ یتیم کا حق مار کھاتا ہے اور اُسے اُس کے باپ کی چھوڑی ہوئی میراث سے بے دخل کر کے اُسے دھکّے مار کر نکال دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یتیم اگر اس سے مدد مانگنے آتا ہے تو رحم کھانے کے بجائے اسے دھتکار دیتا ہے اور پھر بھی اگر وہ اپنی پریشان حالی کی بنا پر رحم کی امید لئے کھڑا رہے تو اُسے دھکّے دے کر دفع کر دیتا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ یتیم پر ظلم ڈھاتا ہے۔ مثلاً اس کے گھر میں اگر اس کا اپنا ہی کوئی رشتے دار یتیم ہو تو اس کے نصیب میں سارے گھر کی خدمتگاری کرنے اور بات بات پر جھڑکیاں اور ٹھوکریں کھانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں اس فقرے میں یہ معنی بھی پوشیدہ ہیں کہ اس شخص سے کبھی کبھار یہ ظالمانہ حرکت سرزد نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی عادت اور اس کا مستقل رویہ یہی ہے۔ اُسے یہ احساس ہی نہیں ہے کہ یہ کوئی بُرا کام ہے جو وہ کر رہا ہے بلکہ وہ بڑے اطمینان سے یہ روش اختیار کیے رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یتیم ایک بے بس اور بے یار و مددگار مخلوق ہے۔ اس لئے کوئی ہرج نہیں اگر اس کا حق مار کھایا جائے یا اسے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنا کر رکھا جائے یا وہ مدد مانگنے کے لئے آئے تو اُسے دھتکار دیا جائے ـــــ اس سلسلے میں ایک بڑا عجیب واقعہ قاضی ابوالحسن الماوردی نے اپنی کتاب "اعلام النبوّۃ" میں لکھا ہے۔ ابوجہل ایک یتیم کا وصی تھا۔ وہ بچّہ ایک روز اس حالت میں اس کے پاس آیا کہ اُس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے اور اُس نے التجا کی کہ اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے وہ اُسے کچھ دے دے۔ مگر اس ظالم نے اُس کی طرف توجہ تک نہ کی اور وہ کھڑے کھڑے آخر کار مایوس ہو کر پلٹ گیا۔ قریش کے سرداروں نے ازراہِ شرارت اُس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا کر شکایت کرو، وہ ابوجہل سے سفارش کر کے تجھے تیرا مال دلوا دیں گے۔ بچہ بیچارہ ناواقف تھا کہ ابوجہل کا حضورؐ سے کیا تعلق ہے اور یہ بدبخت اسے کس غرض کے لئے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ سیدھا حضورؐ کے

پاس پہنچا اور اپنا حال آپؐ سے بیان کیا۔ آپؐ اسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُسے ساتھ لے کر اپنے بدترین دشمن ابوجہل کے ہاں تشریف لے گئے۔ آپؐ کو دیکھ کر اُس نے آپؐ کا استقبال کیا اور جب آپؐ نے فرمایا کہ اس بچے کا حق اسے دے دو تو وہ فوراً مان گیا اور اُس کا مال لا کر اُسے دے دیا۔ قریش کے سردار تاک میں لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں ان دونوں کے درمیان کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ وہ کسی مزے دار جھڑپ کی امید کر رہے تھے مگر جب انھوں نے یہ معاملہ دیکھا تو حیران ہو کر ابوجہل کے پاس آئے اور اُسے طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم! میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دائیں اور بائیں ایک ایک حربہ ہے جو میرے اندر گھس جائے گا، اگر میں نے ذرا بھی اُن کی مرضی کے خلاف حرکت کی ـــــ اس واقعے سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عرب کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور معزز قبیلے تک کے بڑے بڑے سرداروں کا یتیموں اور دوسرے بے یار و مددگار لوگوں کے ساتھ کیا سلوک تھا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کس بلند اخلاق کے مالک تھے اور آپؐ کے اس اخلاق کا آپؐ کے بدترین دشمنوں تک پر کیا رُعب تھا۔"

حضورؐ کی تعلیمات نے ان سخت مزاج لوگوں کی فطرت کو کیسے بدل دیا ـــــ سیرۃ النبیؐ جلد ششم میں یتیموں کے حقوق بیان کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی اس کی یوں وضاحت فرماتے ہیں :

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی۔ وہی دل جو مسکین اور ناتواں یتیموں کے لئے پتھر سے زیادہ سخت تھے، موم سے زیادہ نرم ہو گئے۔ ہر صحابیؓ کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا۔ ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کے لئے کئی کئی ہاتھ آگے بڑھنے لگے۔ اور ہر ایک اُس کی پرورش و کفالت کے لئے اپنے آغوشِ محبت کو پیش کرنے لگا۔ بدر کے یتیموں کے مقابلے میں جگر گوشۂ رسولؐ فاطمہ بتولؓ اپنے دعوے کو اُٹھا لیتی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنے خاندان اور انصار وغیرہ کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لے جا کر دل و جان سے پالتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچے کو ساتھ لیے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے...

..... آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں مگر اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا، تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقے کی دادرسی کی، عرب پہلی سرزمین ہے جہاں کسی یتیم خانے کی بنیاد پڑی اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں، ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لئے بھی امن وچین کے گھر بنائے، اُن کے وظیفے مقرر کئے، مکتب قائم کئے، جائدادیں وقف کیں اور دنیا میں ایک نئے انسٹی ٹیوشن کی طرح ڈالی اور اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ ان یتیموں کے سرپرست بنیں جن کے والی اور سرپرست موجود نہ ہوں اور اُن کی جائدادوں کی نگرانی، ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیاہ کا بندوبست کریں۔"

۵۔ بیوہ کے حقوق

یتیم بچّوں کے بعد سب سے زیادہ ناتواں اور شفقت و ہمدردی کا مستحق طبقہ بیوہ عورتوں کا ہے۔ وہ اُن ساتھیوں سے محروم ہو چکی ہوتی ہیں جنھوں نے انہیں حفاظت بہم پہنچائی تھی، اُن کی ضروریات کو پورا کرنا تھا اور زندگی کی ہر نرمی سختی میں اُن کی رفاقت کا حق ادا کرنا تھا۔ شوہر کی وفات بیوی کے لئے صرف جذباتی صدمہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے اس کی ضروریات بھی متاثر ہوتی ہیں اور عورت جو انسان ہونے کے باعث روح اور مادّے کا مرکّب ہے، شوہر سے محروم ہو جانے کے باعث جذباتی اور مادّی دونوں اقسام کے اندوہ اور اندیشوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایسے حالات بھی عام دیکھے جا سکتے ہیں جہاں میاں بیوی کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے اور زندگی بے اتفاقی میں کٹ رہی تھی۔ مگر جب شوہر قضائے الٰہی سے وفات پا گیا تو بیوی غم و الم سے چُور ہو گئی، کیونکہ اس انسان کے اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکل جانے کے بعد اُسے پتہ چلا کہ اس کے مخصوص معیار پر پورا نہ اُترنے کے باوجود اُس کے شوہر نے اس کی اور اس کے بچّوں کی کتنی ذمہ داریاں سنبھالی

ہوئی تھیں ـــــ غرضکہ شوہر کی وفات بیوی کے لئے ایک بہت بڑا جذباتی اور مادّی غم ہے اور جو عورت اس غم کے چنگل میں پھنس جائے، معاشرے کا فرض ہے کہ اس کے غم و الم کو کم کرنے اور اسے احساسِ محرومی سے بچانے کے لئے جو کچھ بھی کر سکتا ہے کرے۔

اسلام نے بیوہ کو جو حقوق عطا کیے ہیں، ان کی وضاحت کرنے سے پہلے یہ بیان کر دینا مفید ہوگا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مختلف اقوام میں بیوہ عورت سے کیسی بدسلوکی روا رکھی جاتی تھی۔ سید سلیمان ندوی نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"یہودیوں میں بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد دوسرے بھائی کی ملک ہو جاتی تھی۔ وہ جس طرح چاہتا تھا، اس کے ساتھ معاملہ کر سکتا تھا ...... عیسائیوں کے ہاں یہ جبری قانون تو جاتا رہا مگر وہ کوئی دوسرا ایجابی پہلو بھی پیش نہ کر سکے ..... ہندوؤں میں شوہر کی وفات کے بعد بیوی کی زندگی کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی تھی، اب اس کے لئے یہی مناسب تھا کہ اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مر جائے، اور اگر وہ زندہ رہے بھی تو اس صورت میں کہ دنیا کی تمام آرائشوں اور لذّتوں سے علیحدہ ہو کر ساری عمر سوگ میں گزار دے ..... عربوں میں رواج یہ تھا کہ بیوہ شوہر کے وارثوں کی ملکیت بن جاتی تھی اور وہ جو چاہتے اس کے ساتھ کر سکتے تھے۔ اس کو تکلیفیں دے دے کر اس سے مہر معاف کراتے تھے اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہیں شادی نہیں کرنے دیتے تھے۔"

(سیرۃ النبیؐ، جلد ششم)

اسلام آیا تو جہاں اور بہت سے مظلوم طبقات کی داد رسی ہوئی وہاں بیوہ عورتوں کی بھی سُنی گئی۔ اسلام نے بیوہ عورتوں کو جو حقوق دیے وہ مختصراً حسبِ ذیل ہیں:

۶۔ نکاحِ ثانی

سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ بیوہ عورت کے بارے میں پسند یہی کیا گیا ہے کہ وہ دوبارہ نکاح کر کے پھر اسی عزّت و آبرو اور آسائش و حفاظت کی زندگی میں داخل ہو جائے

جس سے وہ خاوند کی وفات کے باعث محروم ہو گئی تھی۔ سورۃ النور آیت ۳۲ میں فرمایا گیا ہے:

وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ۔ "اپنی بیوہ عورتوں اور رنڈوے مردوں کے نکاح کر دو۔"

یہ سخت افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانوں میں بے شمار خاندان ایسے ہیں جو دوسری جاہلی تہذیبوں کے زیرِ اثر بیوہ کے نکاحِ ثانی کو اعتراض کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مندرجہ بالا آیت قرآنی پر غور کرنا اور خدا سے ڈرنا چاہیئے کہ وہ ایک ایسی بات کو قابلِ اعتراض گردانتے ہیں جس کا خدا نے واضح الفاظ میں حکم دیا ہے۔ ہاں البتہ اگر کوئی بیوہ عورت اپنے بچوں کی خیر خواہی کی خاطر یا کسی اور شرعی عذر کی وجہ سے نکاح ثانی نہ کرے اور نیکی سے زندگی گزارے تو ایسا کرنا بالکل جائز ہے لیکن نکاح ثانی سے محض اس لئے پرہیز کرنا کہ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے، خدا تعالیٰ کے مقابلے میں لوگوں کو زیادہ اہمیت دینا ہے۔ اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ لوگوں کے ڈر کے مارے خدا کی ایک حلال ہی نہیں بلکہ پسندیدہ شئے کو حرام کر لینا بے دینی ہی کی نہیں بلکہ حماقت کی بات بھی ہے۔ کیونکہ جب کوئی نوجوان بیوہ بے حفاظت ہونے کے باعث خدانخواستہ کسی آزمائش کا شکار ہو گی تو یہی لوگ، جن کے ڈر کے مارے اس نے تنہا زندگی گزارنے کا تہیّہ کیا تھا، دُگنی شدت سے اس پر انگلیاں اُٹھائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ نکاحِ ثانی کی اجازت عورت کے لئے خدا کی ایک رحمت ہے اور اس کا ایک مفید حق ہے۔ لہٰذا یہ عجیب بات ہے کہ عورت ایک طرف تو اپنے حقوق کے لئے چیخ و پکار کرے اور دوسری طرف ایک ایسے حق کو جو خدا تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا ہوا ہے، استعمال نہ کرنے پر مُصر رہے۔ نکاح ثانی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اس سے چھن گیا ہے وہ سب کچھ دوبارہ حاصل کر لے۔ لہٰذا بیوہ کا اوّلین حق جو اسلام نے بربنائے رحمت اسے عطا فرمایا ہے یہی ہے کہ وہ بیوگی کی غمناک اور ایک حد تک خطرناک فضا سے باہر نکل آئے اور دوبارہ سہاگنوں کی محفوظ اور بہت حد تک پُرسکون اور آرام دہ زندگی کو اختیار کر لے۔ ہاں البتہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اگر اس کے پاس کوئی ایسا شرعی عذر ہے جس کے باعث وہ نکاحِ ثانی

نہیں کرنا چاہتی اور اسے خطرہ ہے کہ نکاح ثانی سے اس کے یتیم بچوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچے گا اور اپنے طبعی میلان کی بنا پر اسے یقین ہے کہ وہ انشاء اللہ نیکی کی زندگی .... گزارے گی تو پھر اسے مجبور بھی نہیں کیا گیا کہ ضرور ہی نکاح ثانی کرے۔ پہلے نکاح ہی سے اس نے سنت کا اتباع تو کر ہی لیا ہے۔

۷۔ رشتہ منتخب کرنے کا اختیار

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بیوہ اپنے نکاح کے معاملے میں کُلّی طور پر خود مختار ہے اور کوئی اسے اپنی رائے کا پابند کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ نہ مرحوم شوہر کے رشتے دار اور نہ اس کے اپنے رشتے دار، کوئی بھی اُسے مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ کسی خاص رشتے کو قبول کرے یا کسی خاص رشتے کو قبول نہ کرے۔ ولی کی اجازت جو علماء کے ایک گروہ کے نزدیک کنواری لڑکی کے لئے ضروری ہے، بیوہ کے لئے ضروری نہیں ہے۔ بیوہ معروف طریقے سے اپنے لئے جو رشتہ مناسب سمجھے وہاں نکاح کر سکتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کنواری لڑکی کا نکاح نہ کیا جائے، جب تک کہ اس سے اجازت نہ لی جائے اور بیوہ کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے حکم نہ لیا جائے .... (بخاری)

یہاں لفظ "حکم" نکاح کے معاملے میں بیوہ کے اختیار کو پوری طرح واضح کیے دے رہا ہے۔

۸۔ آرائش اور سنگھار کا حق

بیوہ عورت جب اپنی عدّت چار مہینے اور دس دن گزارے تو اس کے بعد اسے اس بات کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ شرعی حدود کے اندر آرائش و زیبائش سے کام لے۔ بیوہ کے بارے میں یہ سمجھنا کہ اب اسے بننے سنورنے اور آرائش کرنے کا گویا کوئی حق ہی حاصل نہیں رہا، جاہلانہ خیال ہے اور غیر اسلامی تہذیبوں کی دیکھا دیکھی اختیار

کیا گیا ہے۔ بیوہ کو بھی اچھا کھانے، اچھا پہننے اور خوش و خرم رہنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا سہاگن کو یا ناکتخدا کو۔

۹۔ بیوہ سے ہمدردی اور حسن سلوک کی فضیلت

اگر کوئی بیوہ نیک نیتی سے بیوگی ہی کی زندگی کو اپنے اور اپنے بچوں کے لئے مناسب سمجھتی ہے اور نکاح ثانی نہیں کرتی تو پھر خاوند کے بعد جس رشتے دار پر اس کی کفالت شرعاً لازم آتی ہو، اس کا فرض ہے کہ اس کی کفالت کرے اور بیوہ خواتین سے حسنِ سلوک اور ہمدردی کرنا، اُن کے بگڑے کام بنانے کی سعی کرنا اور اُن کی عزت کرنا تو ہر مسلمان کے لئے باعث اجر و ثواب ہے۔ صحیح بخاری میں عمر بن میمون کی ایک روایت بیان ہوئی ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے فرمایا کہ اگر خدا نے مجھے سلامت رکھا تو میں عراق کی بیوہ عورتوں کو اتنا خوش حال کر دوں گا کہ پھر میرے بعد وہ کبھی بھی کسی کی محتاج نہ ہوں گی۔ عمر بن میمون کہتے ہیں کہ اس واقعے کے چوتھے ہی دن حضرت عمرؓ شہید کر دیے گئے! (بخاری)

زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ بن خطّاب کے ساتھ بازار کی طرف گیا۔ وہاں حضرت عمرؓ کو ایک جوان عورت ملی اور کہنے لگی کہ اے امیر المومنین! میرا شوہر مر گیا ہے اور چھوٹے چھوٹے بچّے چھوڑ گیا ہے۔ خدا کی قسم! اُن کے پاس بکری کا ایک پایہ بھی پکانے کے لئے نہیں ہے نہ اُن کے پاس کوئی کھیتی ہے، نہ دودھ والا جانور۔ مجھے خطرہ ہے کہ قحط انہیں ہلاک کر دے گا اور میں خُفاف بن ایمار غفاریؓ کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ (صلح) حدیبیہ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ (یہ سُن کر) حضرت عمرؓ اس کے پاس کھڑے ہوگئے اور آگے نہ گئے۔ پھر فرمایا: "مرحبا، تمہارا نسب تو میرے نسب سے ملتا ہوا ہے۔" پھر آپؓ ایک طاقتور اونٹ کی طرف آئے جو گھر میں بندھا ہوا تھا اور اس پر دو بوریاں رکھیں اور انہیں اناج سے بھر دیا اور ان کے درمیان نقدی اور کپڑے رکھ دیے، پھر اُس کی رسّی عورت کے ہاتھ میں دے دی اور فرمایا

کہ اسے لے جاؤ، اس کے ختم ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اس سے بہتر عطا کر دے گا۔ (اس پر) ایک آدمی نے کہا کہ یا امیر المومنین! آپؓ نے تو اس عورت کو بہت دے دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: تیری ماں تجھے کھوئے، خدا کی قسم! میں نے اس کے باپ اور بھائی کو دیکھا کہ انھوں نے ایک مدت تک ایک قلعے کا محاصرہ کیے رکھا، یہاں تک کہ اسے فتح کر لیا۔ (بخاری)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیوہ اور مسکین کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا (ثواب ملنے کے لحاظ سے) اس شخص کی مانند ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہو یا (اس کی مانند ہے) جو رات بھر کھڑا عبادت کرتا ہو اور دن بھر روزہ رکھتا ہو۔ (بخاری)

محتاج، مسکین، مفلس، مجبور، اور مصیبت زدہ کے حقوق

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا کہ اے آدمؑ کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو تُو نے میری عیادت نہ کی۔
(انسان) کہے گا کہ اے میرے رب! میں تیری کس طرح عیادت کرتا جب کہ تُو۔۔۔ رب العٰلمین ہے۔
خدا تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تو تُو نے اُس کی عیادت نہ کی۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے آدمؑ کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو تُو نے مجھے کھانا نہ دیا۔
(انسان) کہے گا کہ اے میرے رب! میں تجھے کیسے کھانا دیتا جب کہ تو رب العٰلمین ہے۔
خدا فرمائے گا کہ کیا تجھے علم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا، تو تُو نے اُسے کھانا نہ دیا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تُو اُسے کھانا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا ــــ اے آدمؑ کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو تُو نے مجھے پانی نہ پلایا۔
(انسان) کہے گا کہ اے میرے رب! میں تجھے کیسے پانی پلاتا جبکہ تُو رب العٰلمین ہے ــــ
خدا فرمائے گا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا، مگر تُو نے اُسے پانی نہ پلایا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اسے پانی پلاتا تو اُسے میرے پاس پاتا۔ (مسلم)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک معاشرتی حیوان بنایا ہے جسے قدم قدم پر اپنے ابنائے جنس کی محبت، ہمدردی، امداد اور خیر خواہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں

کی اس باہمی محبت، ہمدردی، امداد اور خیر خواہی کو بہت بڑا ثواب قرار دے دیا ہے اور انسان کے انسان کا دکھ درد بٹانے اور مشکلات میں ایک دوسرے کے کام آنے کو اپنی خوشنودی کے حصول کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ انسانی زندگی ہزارہا اقسام کے آلام کا شکار رہتی ہے جن میں ایک بہت بڑا الم مفلسی ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مفلس کی امداد کی فضیلت بیان کرنے کے علاوہ خود مفلسی کی فضیلت بھی واضح فرمادی ہے۔ وہ مفلس اور محروم لوگ جو اپنی مفلسی اور محرومی کو صبر سے برداشت کرتے اور نیکی پر قائم رہتے ہیں، خدا کے ہاں بہت بڑے اجر کے مستحق ہوتے ہیں۔

حضرت اسامہ بن زید بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو دیکھا کہ داخل ہونے والے عموماً مسکین لوگ ہیں... (مسلم)

سنن ابی داؤد میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی ایک حدیث بیان ہوئی ہے کہ ایک دن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے غریب مہاجرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے فقرائے مہاجرین کی جماعت خوش ہو جاؤ (اُس) نورِ کامل کے باعث (جو تمہیں) قیامت کے دن (ملے گا) تم دولت مندوں سے آدھا دن پہلے جنت میں داخل ہو گے اور وہ (آدھا دن بھی) پانچ سو سال کا ہو گا۔

حضرت معاذؓ بن جبل بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ جنت کے بادشاہ کون ہوں گے۔ میں نے عرض کیا کیوں نہیں (یا رسول اللہ ضرور بتائیے) آپؐ نے فرمایا کہ (جنت کا بادشاہ) وہ شخص (ہو گا) جو کمزور ہے، لوگ اُسے کمزور سمجھتے ہیں، وہ دو پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہے، کوئی اس کی پروا نہیں کرتا (مگر اللہ کی نگاہوں میں اس کا وہ رتبہ ہے کہ) اگر وہ خدا کے بھروسے پر قسم کھالے تو خدا اُسے سچا کر دیتا ہے۔ (ابن ماجہ)

حضرت سہلؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا۔ آپؐ نے (صحابہؓ) سے فرمایا کہ تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو (یعنی تمہارا کیا خیال ہے کہ

یہ شخص کیسا ہے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ اس قابل ہے کہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اس سے نکاح کیا جائے اور اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کی جائے اور اگر بات کرے تو اس کی بات کو غور سے سُنا جائے۔ حضرت سہلؓ کہتے ہیں کہ پھر حضورؐ خاموش ہو گئے۔ پھر غریب مسلمانوں میں سے کوئی شخص پاس سے گزرا تو حضورؐ نے فرمایا کہ (اچھا) اس کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ (تو معمولی آدمی ہے اور) اس قابل ہے کہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اس کے ساتھ نکاح نہ کیا جائے اور اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش کو قبول نہ کیا جائے اور اگر بات کرے تو اس کی بات کو غور سے نہ سُنا جائے — اس پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر دنیا اُس جیسے (امیروں) سے بھری ہوئی ہو تو ان سب سے یہ (غریب) بہتر ہے۔ (بخاری)

غریبی کی فضیلت میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ غریب کو غریب سمجھتے ہوئے اُسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ درحقیقت کتنی کوتاہ بینی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زندگی میں اگر کسی شخص کے متعلق قرائن سے یہ پتہ چل جائے کہ اب یہ بڑا آدمی بننے والا ہے، تو لوگ پہلے ہی سے اس کی خوشامد شروع کر دیتے ہیں اور اس کی نگاہ میں چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ جب اسے بڑائی حاصل ہو تو وہ انھیں فائدہ پہنچائے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جن نیکوکار مفلسوں نے کل خدا کے ہاں بہت بڑے آدمی بن جانا ہے، اُن کی نگاہ میں چڑھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا بلکہ انہیں اس قابل ہی نہیں سمجھا جاتا کہ اُن کی نگاہ میں چڑھنے کے بارے میں سوچا بھی جائے۔ آپ کو کیا معلوم کہ یہ غریب آدمی جو اس وقت عاجزی کی تصویر نظر آ رہا ہے، جو

"کمزور ہے، لوگ اسے کمزور سمجھتے ہیں، وہ دو پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہے اور کوئی اس کی پروا نہیں کرتا۔"

کل خدا تعالیٰ کے ہاں کتنا بڑا بادشاہ ہو گا!! اس وقت شاید آپ کے دل میں یہ حسرت پیدا ہو کہ کاش اس بادشاہ سے ہمارا کوئی تعلق ہوتا جو آج ہمارے لئے باعثِ عزت بنتا۔ تو پھر آپ ابھی سے کیوں نہیں اس کے ساتھ عزت، محبت اور ہمدردی کا

تعلق قائم کر لیتے ؟

یہی نہیں بلکہ ایک اور حقیقت بھی ہے جو کوتاہ نظروں کو شاید کبھی دکھائی نہ دیتی ہو مگر نگاہِ دُور بین رکھنے والے اس سے اچھی طرح واقف ہیں اور وہ یہ ہے کہ بڑے کو چھوٹا اور چھوٹے کو بڑا بننے میں کچھ بھی دیر نہیں لگا کرتی۔ آپ کو کیا معلوم کہ یہ محتاج، مسکین، مفلس، مجبور اور مصیبت زدہ شخص جو اس وقت آپ کی مدد کا متمنی ہے جو اس وقت آپ کو اتنا معمولی نظر آرہا ہے کہ آپ کے خیال میں وہ اسی قابل ہے کہ:

" اگر نکاح کا پیغام دے تو اس سے نکاح نہ کیا جائے اور اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ کی جائے اور اگر بات کرے تو اس کی بات کو غور سے نہ سُنا جائے۔ "

کل آخرت ہی میں نہیں بلکہ خود اس دنیوی زندگی ہی میں اتنا بڑا آدمی نہیں بن جائے گا کہ آپ کو اس کے جاہ و جلال کے مقابلے میں اپنا آپ گھٹیا نظر آنے لگے۔ دنیا میں آئے دن یہ نظارے دیکھنے میں آتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے کسی خاک نشین کو خاک سے اُٹھا کر تخت پر بٹھا دیا اور کسی تخت نشین کو تخت سے گرا کر خاک میں ملا دیا۔

غرضکہ جس نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے اپنے محتاج، مسکین، مفلس، مجبور اور مصیبت زدہ بہن بھائیوں سے عزت اور محبت کا سلوک کرنا اور ان کی امداد کر کے ان کے دکھوں کو کم کرنے کی کوشش کرنا خود اپنے ساتھ خیر خواہی کرنا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ نے اس کارِ خیر کی بہت تاکید فرمائی ہے اور مؤثر الفاظ میں اس کی فضیلت بیان کی ہے۔

حضرت ابو الدرداءؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ مجھے اپنے کمزور و غریب لوگوں میں تلاش کرو کیونکہ تمہارے کمزور اور غریب لوگوں ہی کی وجہ سے تمہیں روزی دی جاتی ہے اور (دشمنوں کے مقابلے میں) تمہاری امداد کی جاتی ہے۔ (ترمذی)

اس حدیث کی تشریح میں بتایا گیا ہے کہ کمزور اور غریب لوگوں کی وجہ سے روزی اور امداد کے دیے جانے سے یا تو یہ مراد ہے کہ اُن کی برکت سے خدا تمہیں روزی اور

امداد دیتا ہے یا یہ سے کہ ان کی دعا کے باعث تمہیں روزی اور امداد ملتی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث بیان ہوئی ہے جس کے ابتدائی حصّے میں اسی بات کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ ضرورت مند کی امداد کرنا بہت زیادہ فضیلت کی بات ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی مومن کی دنیوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دُور کی اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی سختیوں میں سے کوئی سختی دُور فرمائے گا۔ اور جس نے کسی تنگ دست پر آسانی کی، حق تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت میں آسانی کرے گا۔

اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی عیب پوشی کرے گا،

اور جب تک بندہ اپنے (مسلمان) بھائی کی امداد میں لگا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کی امداد فرماتا رہتا ہے ......

(مسلم)

ابواُمامہ بن سہل بن حنیف سے روایت ہے کہ ایک مسکین عورت بیمار ہوئی تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بیماری کی خبر دی گئی۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم (کی عادت تھی کہ آپؐ) مسکینوں کی عیادت کیا کرتے تھے اور ان کا حال پوچھا کرتے تھے۔ پس آپؐ نے فرمایا کہ جب یہ وفات پا جائے تو مجھے خبر کرنا (وہ عورت وفات پا گئی) اور اس کا جنازہ رات کو اُٹھایا گیا اور لوگوں نے اس بات کو پسند نہ کیا کہ حضورؐ کو (رات کے وقت) جگائیں (لہٰذا انھوں نے حضورؐ کو اطلاع دیے بغیر ہی اسے دفن کر دیا) جب صبح ہوئی تو اس کے بارے میں حضورؐ کو بتایا گیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ کیا میں نے تمھیں حکم نہیں دیا تھا کہ اس (کی وفات) کے بارے میں مجھے خبر کرنا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمیں یہ بات پسند نہ آئی کہ آپؐ کو رات کے وقت جگائیں (اس لئے آپؐ کو اطلاع نہ دی) پھر حضورؐ نکلے اور اس کی

قبر کے پاس لوگوں کی صف قائم کی اور چار تکبیریں کہیں۔ (نسائی)

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے ذکرِ الٰہی کیا کرتے تھے اور بیکار باتیں نہ کرتے تھے اور نماز کو لمبا کرتے تھے اور خطبہ چھوٹا رکھتے تھے اور اس بات کو بُرا نہیں جانتے تھے کہ کسی بیوہ اور مسکین کے ساتھ چلیں اور اس کا کام کر دیں۔ (نسائی)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ (حضرت علیؓ کے بھائی) حضرت جعفرؓ بن ابی طالب مسکینوں سے محبت رکھتے تھے اور ان کے پاس بیٹھتے تھے اور ان سے باتیں کرتے تھے اور مساکین ان سے باتیں کرتے تھے (ان کی اس صفت کے باعث) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کنیت ابو المساکین رکھی تھی (یعنی مسکینوں کا باپ)۔ (ابن ماجہ)

حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا تمہارے لئے صدقہ ہے اور تمہارا نیکی کا حکم دینا اور بُرائی سے روکنا (بھی) صدقہ ہے اور تمہارا کسی شخص کو ایسی سرزمین میں راستہ بتانا جہاں لوگ راستہ بھول جاتے ہوں، تمہارے لئے صدقہ ہے اور تمہارا کسی ایسے شخص کی مدد کرنا جس کی بصارت خراب ہو (یعنی نابینا ہو یا کمزور نگاہ والا ہو) تمہارے لئے صدقہ ہے اور تمہارا راستہ سے پتھر، کانٹا اور ہڈی (وغیرہ) کا ہٹا دینا (تاکہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو) تمہارے لئے صدقہ ہے اور تمہارا اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی ڈال دینا (بھی) تمہارے لئے صدقہ ہے۔ (ترمذی)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھوکے کو کھلاؤ اور بیمار کی بیمار پُرسی کرو اور قیدی کو رہائی دلاؤ۔ (ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج تم میں سے کون روزہ دار ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ میں ہوں آپؐ نے فرمایا کہ آج تم میں سے کون جنازے کے ساتھ گیا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ میں (گیا ہوں)۔ آپؐ نے فرمایا کہ آج تم میں سے کس نے کسی مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ میں (نے کھلایا ہے)۔ حضورؐ نے فرمایا کہ آج تم میں سے کس نے کسی مریض

عیادت کی ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ میں (نے کی ہے) اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ جس شخص میں یہ تمام باتیں جمع ہوگئیں وہ جنت میں جائے گا۔ (مسلم)

اعرج بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ بُرا کھانا ہے اس دعوت کا جس میں امیر بلائے جائیں اور مساکین کو چھوڑ دیا جائے ..... (مسلم)

غرض کہ معاشرے کے وہ تمام افراد جو محرومی، پریشانی اور مصائب کا شکار رہوں اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ جو لوگ ان تکالیف سے بچے ہوئے ہیں، وہ اپنے امکان کی حد تک ان کے غم والم اور احتیاج کو دُور کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ ایسا کر کے وہ محروم اور مصیبت زدہ لوگوں کی تو صرف دنیوی تکالیف ہی دُور کریں گے، مگر اپنے آپ کو انشاءاللہ دنیوی اور اخروی دونوں تکالیف سے بچالیں گے۔!

حکمراں اور رعایا کے باہمی حقوق

حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ تمہارے بہترین حاکم وہ ہیں کہ تم اُن سے محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت رکھتے ہیں اور تم ان کے لئے دعا کرتے ہو اور وہ تمہارے لئے دعا کرتے ہیں اور تمہارے بُرے حاکم وہ ہیں کہ تم ان سے بغض رکھتے ہو اور وہ تم سے بغض رکھتے ہیں اور تم ان پر لعنت بھیجتے ہو اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہیں ..... (مسلم)

اس حدیث مقدس میں کمال خوبصورتی سے واضح فرما دیا گیا ہے کہ ایک اچھے معاشرے میں حکمراں اور رعایا کے باہمی تعلقات کیسے ہونے چاہییں۔ قرآنِ پاک، احادیثِ نبویہؐ اور سلفِ صالحین کے اقوال میں ہمیں ایک اسلامی ریاست کے حکمراں اور رعایا کے باہمی حقوق و فرائض کے بارے میں جو کچھ ملتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رعایا کا حق ہے کہ:

۱۔ انھیں صحیح اسلامی زندگی بہم پہنچائی جائے،

۲۔ ان پر دیانتدار، خداترس اور اہل افسر مقرر کیے جائیں،

۳۔ ان کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کا کما حقہٗ بندوبست ہو،

۴۔ انھیں عدل و انصاف بہم پہنچایا جائے،

۵۔ اور انھیں حکمرانوں کی بے راہروی اور ان کے مظالم کے خلاف حقِ تنقید، اور حقِ فریاد حاصل ہو۔

دوسری طرف حکمراں کو بھی حق حاصل ہے کہ اگر وہ رعایا کے حقوق پورے کر رہا ہے

تو رعایا بھی اس کے حقوق پورے کرے، جن میں نمایاں حقوق یہ ہیں کہ رعایا:
۱۔ تمام جائز امور میں حکمراں کے ساتھ تعاون کرے اور اس کی اطاعت سے قدم باہر نہ نکالے۔
۲۔ اور اس کی وفادار اور خیر خواہ رہے۔

۱۔ رعایا کے حقوق

یہ جو کہا جاتا ہے کہ رعایا کا حق ہے کہ انہیں صحیح اسلامی زندگی بہم پہنچائی جائے۔ اس پر بظاہر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ تو رعایا کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ صحیح اسلامی زندگی گزاریں، حکمراں انہیں اسلامی زندگی کیسے بہم پہنچائے، مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی معاشرے میں کسی خاص طرز کی معاشرت کے رائج ہو جانے میں معاشرے کے اہل اقتدار کا بہت زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ عربی کا ایک مقولہ ہے۔ "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ"۔ یعنی لوگ اپنے بادشاہوں کے طریقے پر چلا کرتے ہیں۔ بنو اُمیّہ کی خلافت کے دوران تین خلفا یکے بعد دیگرے آئے۔ تینوں کے خاص خاص میلانات تھے۔ مؤرخ بتاتے ہیں کہ عوام کا ذوق ان کے ساتھ ساتھ ہی بدلتا گیا۔ پہلے خلیفہ ولید بن عبد الملک تخت نشین ہوا۔ اسے تعمیرات کا بہت شوق تھا، چنانچہ اس کے عہد میں جب چند آدمی کہیں جمع ہوتے تو وہ عمارتوں ہی کی باتیں کرتے، پھر سلیمان بن عبد الملک کا عہد آیا۔ اُسے شادیاں کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے عہد میں جب چند اشخاص یکجا ہوتے تو نکاح، شادی اور کنیزوں وغیرہ ہی کی باتیں کرتے۔ پھر بنو امیہ کے سب سے زیادہ دیندار اور نیکوکار خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا عہد آیا تو وہی پبلک جو پہلے تعمیرات اور پھر نکاح اور شادیوں کی باتیں کیا کرتی تھی، ایسی بدل گئی کہ جب کہیں چند آدمی جمع ہوتے تو عبادت، ریاضت اور قرآن و حدیث ہی کی باتیں کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا اولین فریضہ دین کا نفاذ ہے۔ اس فریضے کو ادا کرنے کے لئے ایک طرف اسے اسلامی علاقے میں اسلامی قوانین نافذ کرنے ہوں گے اور دوسری طرف لوگوں کو اس قابل بنانے کے لئے کہ وہ ان قوانین کو خوشی سے قبول کریں، ایسے

ذرائع اختیار کرنے ہوں گے جن سے عوام دینی احکام سے واقف ہوں اور ان کے دلوں میں دین کی محبت جگہ پکڑے۔ جس طرح اولاد کا یہ حق ہے کہ ان کی پرورش کرنے کے علاوہ انہیں اچھی تربیت بھی دی جائے اسی طرح اسلامی حکومت کی رعایا کا بھی حق ہے کہ ان کی حفاظت اور مادی ضروریات کا بندوبست کرنے کے علاوہ انہیں ایسا ماحول بھی بہم پہنچایا جائے جس میں اسلامی احکام نافذ ہوں اور اُن کے لئے ایسے ادارے قائم کئے جائیں جو انہیں دینی تربیت دیں۔ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو عوام پر فضیلت دے کر حکمرانی کا اعزاز بخشتا ہے، ان کے کندھوں پر وہ یہ بھاری بوجھ بھی ڈالتا ہے کہ وہ عوام کے خیر خواہ ہوں اور انہیں راہِ راست پر چلائیں۔ سورۃ الحج آیات ۴۰ اور ۴۱ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

"اللہ ضرور ان لوگوں کی امداد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

ایسے ہی عوام کا یہ بھی حق ہے کہ جو افسر اُن پر مقرر کیے جائیں وہ اپنے فرائض ادا کرتے میں دیانتدار ہوں اور جو کام اُن کے سپرد کیے جائیں، اُن کاموں کو کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ حضرت عمرؓ کے عہد کی کامیابی کی وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ انہیں انسانوں کی خوب پہچان تھی اور وہ سلطنت کے مختلف کاموں کے لئے صحیح قسم کے لوگ منتخب کیا کرتے تھے۔ یہ افسر لوگ عوام کی مختلف ضروریات پورا کرنے کا بندوبست کرنے ہی کے لئے تو مقرر کیے جاتے ہیں۔ جب انہیں منتخب کرتے ہوئے ان کی دیانت اور اہلیت کو نہیں دیکھا جاتا تو وہ اپنے فرائض کو لاپروائی اور بے ڈھنگے پن سے سرانجام دیتے ہیں جس سے رعایا کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس طرح حکمران غلط قسم کے افسر مقرر کر کے رعایا کے حقوق تلف کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ اس معاملے میں بہت فکر مند رہا کرتے تھے کہ اُن کے افسر عوام پر ظلم نہ کرنے پائیں۔ ابو فراس راوی بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت عمرؓ بن خطاب نے (لوگوں کے سامنے) خطبہ دیا اور فرمایا کہ میں نے اپنے افسروں کو اس لئے نہیں بھیجا کہ وہ تمہارے جسموں کو ماریں

اور نہ اس لئے (بھیجا ہے) کہ وہ تمہارے مال لے لیں۔ پس جس (افسر) نے بھی ایسا کیا اُس کا مقدمہ میرے پاس لانا میں اُس سے بدلہ لوں گا۔ (ابوداوٗد)

حضرت عمرؓ خود رعایا کے ساتھ اتنی محبت رکھتے تھے کہ ایک دفعہ قحط کے باعث لوگ تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔ ایک شخص نے آپؓ کو بتایا کہ میں نے اتنی مدت سے گھی نہیں کھایا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں بھی گھی نہیں کھاؤں گا جب تک لوگوں کی حالت پہلے کی سی نہ ہو جائے یعنی ارزانی نہ ہو جائے۔

سورۃ النساء آیت ۵۸ میں فرمایا گیا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰٓى أَهْلِهَا ۙ "(مسلمانو!) اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو۔"

"بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انھوں نے اپنے انحطاط کے زمانے میں امانتیں یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے مرتبے ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیے جو نا اہل، کم ظرف، بداخلاق، بددیانت اور بدکار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بُرے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ یہاں مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم ایسے نہ کرنا بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں یعنی جن میں بارِ امانت اُٹھانے کی صلاحیت ہو۔" (تفہیم القرآن، جلد اول، صفحہ ۳۶۲)

ایسے ہی رعایا کا حق ہے کہ حکمران دیانتداری اور خیر خواہی سے اُن کی خدمت کرے۔ اپنے اختیارات سے کام لے کر انہیں ظلم وستم کا نشانہ نہ بنائے۔ ان کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری حفاظت کرے، انہیں انصاف بہم پہنچائے اور انہیں ایک دوسرے کی زیادتی سے محفوظ رکھے۔

(یزید کا گورنر) عبیداللہ بن زیاد (رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی) حضرت معقِلؓ بن یسار مُزنیؓ کے مرض الموت کے دوران ان کی عیادت کے لئے گیا۔ حضرت معقلؓ نے اس سے فرمایا کہ میں تم سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں جو میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی تھی۔ اگر میں جانتا کہ میں (ابھی) کچھ دیر اور زندہ رہوں گا تو تجھے (یہ حدیث)

نہ بنا تا (سنو کہ) میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ جس بندے کو خدا نے کسی رعیت کا نگراں بنایا ہو اور وہ اس حالت میں مرے کہ اپنی رعیت کے ساتھ دغا بازی کر رہا ہو تو خدا اُس پر جنت حرام کر دے گا۔ (مسلم)

اسی عبید اللہ بن زیاد کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عائذؓ بن عمرو اس کے پاس گئے اور فرمایا کہ اے بیٹا، میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ بدترین چرواہا وہ ہے جو (جانوروں پر) ظلم کرتا ہے، پس تو اس بات سے بچ کہ اُن (ظالم) لوگوں میں سے ہو۔ (مسلم)

یہاں چرواہے سے مراد حکمراں ہے۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ رعایا پر ظلم کرنے والا حکمراں بدترین حکمراں ہے۔

حضرت عائشہؓ نے ایک حدیث بیان کی ہے جس میں وہ بتاتی ہیں کہ انھوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا:

"خدایا! جو شخص میری امت کے معاملات میں سے کسی معاملے کا ولی بنایا جائے اور پھر وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اُس پر سختی کر اور جو میری امت کے معاملات میں سے کسی معاملے کا ولی بنایا جائے اور وہ اُن پر نرمی کرے تو تو بھی اُس پر نرمی کر۔" (مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امام (یعنی حکمراں) ڈھال (کی مانند) ہوتا ہے جس کی آڑ میں لڑا جاتا ہے اور جس کے ذریعے (آفتوں سے) بچا جاتا ہے پس اگر وہ خدا سے ڈرتے ہوئے حکم کرے اور انصاف کرے تو اُسے اس کا اجر ملے گا اور اگر وہ اس کے خلاف کرے (یعنی خدا سے بے خوف ہو کر حکم دے اور بے انصافی کرے) تو اس سے اُس پر وبال ہو گا۔ (نسائی)

اسلام میں حکمرانوں کو عوام کی تنقید سے بالا نہیں قرار دیا گیا بلکہ عوام کو حق دیا گیا ہے کہ اگر حکمراں غلط راہوں پر چلیں تو وہ انہیں ٹوکیں۔ اس معاملے میں بھی حضرت عمرؓ بن خطاب نے نہایت روشن نمونے چھوڑے ہیں۔ ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت عمرؓ کو ٹوکا۔ کسی دوسرے شخص نے اس ٹوکنے والے کو ٹوکا اور کہا کہ تم نے حد کر دی، اب بس کرو۔ اس پر حضرت عمرؓ

نے فرمایا کہ اسے ٹوکنے دو۔ اگر لوگ ہمیں ٹوکیں گے نہیں تو اُن کا وجود بے کار ہے اور اگر ہم ان کی سنیں گے نہیں تو ہم بے کار ہیں۔

حضرت عمرؓ ان مثالی حکمرانوں میں سے تھے جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ حکمرانی کا مطلب درحقیقت رعایا کی خدمت ہوتا ہے۔ ایک دن آپ بیت المال کے کسی اونٹ کی خدمت کر رہے تھے۔ کسی شخص نے کہا کہ امیرالمومنین کسی غلام کو حکم دیا ہوتا کہ یہ کام کر دیتا۔ آپؓ نے فرمایا کہ مجھ سے بڑا غلام اور کون ہے!

۲۔ حکمراں کے حقوق

قرآن وسنت میں جہاں ایک طرف رعایا کے حقوق قائم کئے گئے ہیں وہاں دوسری طرف حکمراں کے حقوق کی بھی وضاحت فرمادی گئی ہے کیونکہ جس انسان کے کندھوں پر رعایا کے حقوق ادا کرنے کی بھاری ذمہ داری ڈالی گئی ہو، وہ اپنے فرض منصبی کو اس وقت تک کماحقہٗ انجام نہیں دے سکتا، جب تک رعایا بھی اس کی خیرخواہ نہ ہو اور اس کے احکام کی پوری پوری اطاعت نہ کرے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

بے شک دین خیرخواہی کا نام ہے،
بے شک دین خیرخواہی کا نام ہے،
بے شک دین خیرخواہی کا نام ہے،

صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ کس کی (خیرخواہی)۔ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ کی، اور اس کی کتاب کی اور اُس کے رسولؐ کی اور مسلمانوں کے حاکموں کی اور مسلمان عوام کی۔ (نسائی)

ایسے ہی قرآن وحدیث میں اس بات کی تاکید آئی ہے کہ تمام جائز امور میں حکمراں کی اطاعت کی جائے۔ سورۃ النساء آیت ۵۹ میں فرمایا گیا ہے:

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی

وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ج اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔"

تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۳۶۴ پر اس لفظ "اولی الامر" کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ "اولی الامر کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں خواہ وہ ذہنی اور فکری رہنمائی کرنے والے علماء ہوں یا سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر یا ملکی انتظام کرنے والے حکّام یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج یا تمدنی اور معاشرتی امور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلّوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحبِ امر ہے، وہ اطاعت کا مستحق ہے۔"

حضرت ابواُمامہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حجۃ الوداع کے موقع پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے سُنا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ سے، جو تمہارا ربّ ہے، ڈرو اور اپنی پانچ نمازیں پڑھو اور اپنے مہینے کے روزے رکھو اور اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرو اور جب (حاکم) تمہیں حکم دے تو اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنّت میں داخل ہو گے۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اُس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی اور جس نے حاکم کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی اور جس نے حاکم کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی۔ (مسلم)

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (حاکم کی بات) سنو اور اس کی اطاعت کرو چاہے تم پر ایک حبشی غلام ہی کو حاکم بنا دیا جائے جس کا سر ایسا ہو گویا منقّیٰ ہے۔ (بخاری)

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو اپنے حاکم کی کوئی بات ناپسند ہو تو اسے صبر کرنا چاہیئے کیونکہ جو حاکم کی اطاعت سے ایک بالشت بھی باہر ہوا وہ جاہلیت کی موت مرا۔ (بخاری)

حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت فرمائی کہ میں (حاکم کی) بات سنوں اور اطاعت کروں اگرچہ وہ (حاکم) ایک ہاتھ پاؤں کٹا

غلام ہی کیوں نہ ہو۔ (مسلم)

حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک عورت، جسے کوڑھ کی بیماری تھی، خانہ کعبہ کا طواف کررہی تھی، حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا کہ اے خدا کی کنیز! لوگوں کو اذیت نہ دے، کاش تو اپنے گھر بیٹھتی۔ وہ عورت یہ سن کر اپنے گھر بیٹھ گئی۔ پھر جب حضرت عمرؓ کی وفات ہوگئی تو ایک شخص اس عورت کے پاس سے گزرا اور اس سے کہا کہ جس نے تمہیں منع کیا تھا وہ وفات پاگیا ہے، اس لئے اب تو گھر سے باہر نکل آ۔ مگر وہ اطاعت شعار عورت بولی کہ میں ایسی نہیں ہوں کہ زندگی میں جس کی اطاعت کرتی رہی، اب اس کی وفات کے بعد اس کی نافرمانی کرنے لگوں۔

غرضنکہ حاکم کی اطاعت ازحد ضروری ہے تاہم یہ اطاعت اسی صورت میں ہوگی کہ حاکم کسی ناجائز بات کا حکم نہ دے۔ اگر کوئی حاکم ایسا حکم دے جو خدا تعالیٰ کے احکام کے خلاف ہو تو اس میں اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان آدمی پر واجب ہے کہ (امیر کی) اطاعت کرے، اس بات میں بھی جو پسند ہو اور اس میں بھی جو ناپسند ہو، بشرطیکہ اسے کسی گناہ کا حکم نہ دیا جائے اور اگر اُسے (امیر کی طرف سے) کسی گناہ کا حکم دیا جائے تو پھر نہ اس کی بات سننی ہے اور نہ اس کی اطاعت کرنی ہے۔

(بخاری)

صحیح بخاری میں حضورؐ کے عہد کا ایک دلچسپ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضورؐ نے ایک چھوٹا لشکر کسی طرف بھیجا اور ایک انصاری کو اس کا امیر بنایا اور لشکر والوں کو حکم دیا اپنے امیر کی اطاعت کرتے رہیں۔ ایک دن وہ امیر کسی بات پر ناراض ہوگئے اور لوگوں سے کہنے لگے کہ کیا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تم لوگوں کو حکم نہیں دیا تھا کہ میری اطاعت کرنا۔ لوگوں نے کہا کہ کیوں نہیں، حضورؐ نے ہمیں حکم دیا تھا۔ امیر کہنے لگے کہ پھر میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ لکڑیاں جمع کرو اور آگ جلاؤ اور پھر اس میں داخل ہوجاؤ۔ لوگوں نے لکڑیاں اکٹھی کیں اور آگ جلادی، پھر جب اس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو کھڑے ہوکر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اُن میں سے بعض نے کہا کہ آگ ہی سے تو بچنے کے لئے ہم نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی

پیروی اختیار کی تھی تو کیا پھر ہم آگ میں داخل ہو جائیں۔ وہ اسی سوچ بچار میں تھے کہ آگ بجھ گئی اور امیر کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ جب یہ لوگ واپس آئے تو حضورؐ سے اس واقعے کا ذکر کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس آگ میں داخل ہو جاتے تو پھر کبھی بھی اس سے نہ نکلتے اور آپؐ نے لوگوں کو سمجھایا کہ امیر کی اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہوتی ہے گناہ کے کاموں میں اطاعت نہیں کی جاتی۔!

عورت کے حقوق

حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ "خدا کی قسم ہم زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو کسی شمار میں نہیں لاتے تھے، یہاں تک کہ اللہ نے اُن کے حق میں نازل کیا جو کچھ کہ نازل کیا اور مقرر فرمایا جو کچھ کہ مقرر فرمایا۔" (بخاری)

حضرت عمر فاروقؓ کا مندرجہ بالا بیان اور اس کے علاوہ زمانۂ جاہلیت کے بارے میں ملنے والے تاریخی مواد سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ اسلام سے پہلے عورت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور بیٹی کی پیدائش کو ننگ و عار کی بات سمجھا جاتا تھا۔ سورۃ النحل، آیات ۵۸، ۵۹ میں فرمایا گیا ہے:

> "جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بُری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا اُسے مٹی میں دبا دے۔"

زمانۂ جاہلیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ بعض قبائل میں سنگدلی اس انتہا تک پہنچی ہوئی تھی کہ بیٹی پیدا ہونے پر اسے زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جاہلیت کی اس قبیح رسم پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا یہ بے رحمانہ طریقہ قدیم زمانے میں مختلف وجوہ کے باعث رائج ہو گیا تھا۔ ایک معاشی خستہ حالی، جس کے باعث لوگ چاہتے تھے کہ کھانے والے

کم ہوں اور اولاد کو پالنے پوسنے کا بار اُن پر نہ پڑے، بیٹوں کو تو اس امید پر پال لیا جاتا تھا کہ بعد میں وہ حصولِ معیشت میں ہاتھ بٹائیں گے مگر بیٹیوں کو اس لئے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ انہیں جوان ہونے تک پالنا پڑے گا اور پھر انہیں بیاہ دینا ہو گا۔ دوسرے عام بدامنی، جس کی وجہ سے بیٹوں کو اس لئے پالا جاتا تھا کہ جس کے جتنے زیادہ بیٹے ہوں گے اس کے اتنے ہی حامی و مددگار ہوں گے مگر بیٹیوں کو اس لئے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ قبائلی لڑائیوں میں اُلٹی ان کی حفاظت کرنی پڑتی تھی اور دفاع میں وہ کسی کام نہ آسکتی تھیں۔ تیسرے عام بدامنی کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ دشمن قبیلے جب ایک دوسرے پر اچانک چھاپے مارتے تھے تو جو لڑکیاں بھی اُن کے ہاتھ لگتی تھیں، اُنہیں لے جا کر وہ یا تو لونڈیاں بنا کر رکھتے تھے یا کہیں بیچ ڈالتے تھے۔ ان وجوہ سے عرب میں یہ طریقہ چل پڑا تھا کہ کبھی تو زچگی کے وقت ہی عورت کے آگے ایک گڑھا کھود کر رکھا جاتا تھا تاکہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اُسی وقت اُسے گڑھے میں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دی جائے اور کبھی اگر ماں اس پر راضی نہ ہوتی یا اس کے خاندان والے اس میں مانع ہوتے تو باپ بادلِ نخواستہ اسے کچھ مدت تک پالتا اور پھر کسی وقت صحرا میں لیجا کر زندہ دفن کر دیتا۔ اس معاملے میں جو شقاوت برتی جاتی تھی اس کا قصہ ایک شخص نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ بیان کیا۔ سُننِ دارمی کے پہلے ہی باب میں یہ حدیث منقول ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ سے اپنے عہدِ جاہلیت کا ایک واقعہ بیان کیا "میری ایک بیٹی تھی جو مجھ سے بہت مانوس تھی، جب میں اس کو پکارتا تو دوڑی دوڑی میرے پاس آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کو بلایا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ راستے میں ایک کنواں آیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنویں میں دھکا دے دیا۔ آخری آواز جو اس کی میرے کانوں میں آئی، وہ تھی ہائے ابا، ہائے ابا۔ یہ سن کر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم رو دیے اور آپؐ کے آنسو بہنے لگے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ اے شخص تُو نے حضورؐ کو غمگین کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اسے مت روکو، جس چیز کا اسے سخت احساس ہے اس کے بارے میں اسے سوال کرنے دو۔ پھر آپؐ نے اس سے فرمایا کہ اپنا قصہ پھر بیان کر۔ اس نے دوبارہ اسے بیان کیا اور آپ سن کر اس قدر روئے کہ آپؐ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔"

(تفہیم القرآن، جلد ششم، صفحہ ۲۶۵)

یہ حالت تو عورت کی بحیثیت بیٹی کے تھی، بیوی کی حیثیت سے بھی وہ گوناگوں .... پریشانیوں کا شکار تھی۔ مردوں کا ان کے ساتھ یہ رویہ تھا کہ نکاحوں کی تعداد پر کوئی قید نہ تھی، چاہے کوئی مرد سو عورتوں سے شادی کر لے، نہ طلاق کے معاملے میں کوئی پابندی تھی چاہے شوہر بیوی کو سو دفعہ طلاق دے اور سو دفعہ رجوع کر لے۔ اسلام میں طلاق کا طریقہ یہ ہے کہ شوہر بیوی کو صرف دو دفعہ طلاق دے کر رجوع کر سکتا ہے۔ جب وہ تیسری دفعہ طلاق دے گا تو پھر اسے رجوع کرنے کا حق نہیں رہے گا اور وہ عورت پورے طور پر اس کے نکاح کی قید سے آزاد ہو جائے گی۔ جاہلیت میں چونکہ کوئی ایسی حد نہیں تھی جہاں جا کر رجوع کرنا حرام ہوتا، اس لئے بعض خاوند بیویوں کو عمر بھر لٹکائے رکھتے، بار بار طلاق دیتے، بار بار رجوع کر لیتے اور اس طرح نہ تو اس عورت کو ڈھنگ سے رکھتے اور نہ اسے آزاد ہی کرتے کہ وہ کہیں اور نکاح کر لے۔ اسلام نے رجوع کرنے کی ایک حد قرار دے کر عورت کو بہت بڑے عذاب سے نجات دی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں عورت پر جو مظالم ڈھائے جاتے تھے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ جب کوئی شخص وفات پا جاتا تو اس کا بیٹا باپ کی جائیداد کے علاوہ بیوہ سوتیلی ماں کا بھی مالک بن بیٹھتا تھا۔

عورت کے ساتھ یہ معاملہ صرف عرب ہی میں نہیں تھا بلکہ تاریخی بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ دوسرے علاقوں میں بھی عورت کی حالت خراب تھی۔ مثلاً ہندوستان میں بدھ مت اور جین مت کے پیرو عورت کو اپنی روحانی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور اس سے علیحدہ رہنے اور تارک الدنیا بن کر زندگی گزارنے کو روحانی اور اخلاقی بلندی کا ذریعہ گردانتے تھے۔ بدھ مت اور جین مت کے علاوہ خود ہندوؤں کے ہاں ستی ہونے کی ظالم رسم کا مدتوں رواج رہا۔ جب کسی مرد کی بیوی مر جاتی تو اسے پورا حق حاصل ہوتا کہ دوسری شادی کر لے لیکن جب کسی عورت کا خاوند مر جاتا تو بیوی کو میت کے ساتھ ہی چتا میں لٹا کر زندہ جلا دیا جاتا۔ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو یہ ظالمانہ رسم یہاں موجود تھی۔ تاریخ میں ایک مشہور واقعہ بیان ہوا ہے کہ کسی ہندو رانی نے ستی ہونے سے بچنے

کے لئے مغل حکمران ہمایوں سے مدد مانگی تھی اور ہمایوں اس کی مدد کو پہنچا تھا۔

بسا اوقات ہندو عورت خاوند کے مرنے پر اپنی خوشی سے ستی ہو جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو عورت کی حیثیت کے بارے میں جو غلط نظریات اس کے ذہن نشین کیے گئے ہوتے تھے، اُن کی بنا پر وہ دل سے یہی سمجھتی تھی کہ شوہر کے بغیر اس کی زندگی بے کار ہے اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہندو معاشرے میں بیوہ عورت کی وہ مٹی پلید ہوتی تھی کہ اس طرح عمر بھر جلتے رہنے سے اسے یہ بہتر معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہی دفعہ جل کر اپنی اذیت ختم کر لے۔ خاوند کے بعد اگر وہ زندہ رہ بھی جاتی تھی تو اسے بڑی بھیانک زندگی گزارنی پڑتی تھی۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی وہ تمام خوشیوں سے محروم رہتی تھی۔ اُسے سنگھار کرنے یا اچھا کھانے یا اچھا پہننے کا کوئی حق حاصل نہ ہوتا تھا۔ اس کے وجود کو نحوست کی نشانی گردانا جاتا تھا اور مبارک موقع پر اس کا سایہ پڑ جانا بھی سخت برا سمجھا جاتا تھا۔

یہی حال بہت سے دوسرے علاقوں کا تھا۔ عیسائی پادری "عورت" اور "گناہ" کو ایک ہی چیز قرار دیتے تھے۔ یہودیوں کا یہ طریقہ تھا کہ بعض خاص حالات میں عورتوں کو گھروں ہی سے نکال دیا کرتے تھے اور ایران میں مزدک نے عورت کو مشترک ملکیت قرار دے رکھا تھا۔ ماضی قریب تک بعض ایسے علاقوں میں بھی جو اپنے آپ کو بہت مہذب قرار دیتے ہیں، عورت کو ورثے کا حق حاصل نہیں تھا اور وہ اپنی ذاتی جائداد میں بھی غیر مشروط طور پر تصرف نہیں کر سکتی تھی۔

عورت اس مظلومی کی حالت میں تھی جب پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کا آخری پیغام لے کر دنیا میں تشریف لائے اور آپؐ نے دوسرے مظلوموں کی طرح اس مظلوم صنف کی بھی دادرسی فرمائی اور اسے مخصوص حقوق عطا فرمائے اور مخصوص فرائض اس کے ذمے لگا کر اسے معاشرے میں ایک باوقار اور ذمہ دار رتبہ عطا فرمایا۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کسی نظامِ زندگی نے عورتوں کو کتنے حقوق دیے ہیں ـــــ مندرجہ ذیل مسائل پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے:

۱۔ اس نظامِ زندگی میں عورت کا مقام بحیثیت ماں، بیٹی، بیوی، بہن او

بحیثیت عورت کے کیا ہے؟

۲۔اس نظامِ زندگی نے مالی لحاظ سے عورت کو مضبوط کیا ہے یا کمزور رکھا ہے؟

۳۔اس معاشرے میں عورت کو اپنا شریکِ زندگی چننے کا کہاں تک اختیار حاصل ہے؟

۴۔ اگر وہ شریکِ زندگی ظالم ثابت ہو تو اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی راستہ ہے یا نہیں؟

۵۔وہ نظامِ حیات عام زندگی میں عورت کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنیکا حکم دیتا ہے؟

۶۔اس نظامِ زندگی میں عورت کو گھر سے باہر نکلنے اور مجالسِ خیر اور قومی زندگی کے دوسرے ضروری معاملات میں حصّہ لینے کا حق کہاں تک حاصل ہے؟

جہاں تک پہلے چار سوالوں کا تعلق ہے، گذشتہ صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے کہ اسلام نے عورت کو بحیثیت ماں، بہن، بیٹی، بیوی، خالہ وغیرہ کے کیا مقام عطا فرمایا ہے اور کس طرح اسے والدین، خاوند اور بیٹے کے ترکے کا وارث قرار دے کر اور اُسے مہر اور نان و نفقے کا حقدار بنا کر اس کی مالی حالت کو مضبوط کیا ہے۔ وہ اپنی ذاتی ملکیت میں غیر مشروط طور پر تصرف کرنے کی حقدار ہے اور کوئی شخص بھی اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر اس کے مال میں سے کچھ لے لینے کا حقدار نہیں۔ اسی طرح "بیوی کے حقوق" میں یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ اگر کوئی عورت خاوند کے ہاتھوں نالاں ہو اور خاوند اسے طلاق دینے پر بھی آمادہ نہ ہو تو وہ خلع کے ذریعے اس سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ ایسے ہی "بیوہ کے حقوق" میں وہ حدیث بھی بیان کی جا چکی ہے جس میں حضورؐ نے ہدایت فرمائی ہے کہ کنواری لڑکی کی شادی نہ کی جائے جب تک اس کا اذن نہ لے لیا جائے۔ اور بیوہ کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس کا حکم نہ حاصل کر لیا جائے۔ اب یہاں قرآن اور حدیث کی روشنی میں اس بات کی کچھ مزید صراحت کی جا رہی ہے کہ اسلام نے کس طرح عورت کو معاشرے میں ایک باوقار مقام عطا فرمایا ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے اور آپؐ کے ساتھ آپؐ کا ایک حبشی غلام تھا، جسے انجشہ کہا جاتا تھا۔ وہ حُدی پڑھتا تھا (جس سے

اونٹ تیز چلنے لگتے) اس پر آپؐ نے اسے فرمایا کہ تیری خرابی ہو اے انجشہ! ان شیشوں کو آہستہ لے چل۔! (بخاری)

حُدی وہ گیت ہوتا ہے جو ساربان گاتے ہیں تو اونٹ تیز چلنے لگتے ہیں اور شیشوں سے حضورؐ کی مراد خواتین تھیں جو اونٹوں پر سوار تھیں۔ آپؐ نے انجشہ کو ہدایت فرمائی کہ اونٹوں کو تیز نہ چلائے تاکہ خواتین کو تکلیف نہ ہو!

واضح رہے کہ اسلام میں عورت کو اپنے اعمال کی خود ذمہ دار قرار دیا گیا ہے اور اسے مرد کا ضمیمہ نہیں بنایا گیا۔ حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویاں خدا کی نافرمان عورتیں تھیں اس لیے انبیاء کی بیویاں ہونے کے باوجود انھیں عذاب کی مستحق قرار دیا گیا اور آسیہ خاتون نیک خاتون تھیں، اس لیے فرعون جیسے باغی اور سرکش انسان کی بیوی ہونے کے باوجود انھیں فضیلت عطا کی گئی!

احادیث سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کو کسی کو پناہ دینے کا حق حاصل ہے اور اُسے گھر سے نکلنے، مسجد کی جماعت میں شرکت کرنے، مجالسِ خیر میں شریک ہونے اور جہاد میں حصّہ لینے کی بھی اجازت ہے اور وہ اس بات کی حقدار ہے کہ اسے زیورِ علم سے آراستہ کیا جائے۔

۱۔ امان دینا

حضرت علیؓ کی ہمشیر حضرت ام ہانیؓ بنتِ ابی طالب بیان کرتی ہیں کہ میں فتح مکہ کے سال حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپؐ کو غسل کرتے پایا، اس طرح کہ آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ آپؐ کے سامنے پردہ کئے ہوئے تھیں۔ میں نے آپؐ کو سلام کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں ہوں امّ ہانیؓ بنت ابی طالب! تو آپ نے فرمایا کہ: خوش آمدید امّ ہانی! ـــــ پھر جب آپؐ غسل سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے کھڑے ہو کر آٹھ رکعات پڑھیں اس طرح کہ آپؐ ایک ہی کپڑا لپیٹے ہوئے تھے۔ پھر جب آپؐ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں نے فلاں شخص ابن ہُبیرہ (نامی) کو پناہ دی مگر میرا ماں جایا (بھائی) کہتا ہے کہ میں اسے قتل کردوں گا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اے ام ہانیؓ جس کو تو نے پناہ دی اس کو ہم نے پناہ دی۔ . . . (بخاری)

۲- باہر نکلنا

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ (ام المومنین) حضرت سودہؓ بنت زمعہ رات کے وقت (کسی کام کے لیے) باہر نکلیں تو حضرت عمرؓ نے انہیں دیکھ کر پہچان لیا اور فرمایا کہ خدا کی قسم! سودہؓ آپ ہم سے چھپ نہیں سکتیں (یعنی ہمیں پتہ چل گیا کہ آپ باہر نکلی ہیں) حضرت سودہؓ لوٹ کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپؐ سے اس بات کا ذکر کیا۔ اس وقت حضورؐ میرے حجرے میں شام کا کھانا تناول فرمارہے تھے اور آپؐ کے ہاتھ میں ایک ہڈی تھی (اس حالت میں) آپؐ پر وحی نازل ہونی شروع ہوگئی اور جب آپؐ سے وحی کی کیفیت دور ہوئی تو آپؐ فرمارہے تھے کہ (اے عورتو!) تمہیں اپنے ضروری کاموں کے لئے باہر نکلنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ (بخاری)

۳- مسجد میں جانا

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کی عورت اس سے (مسجد جانے کی) اجازت مانگے تو وہ اسے مت روکے۔ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کی ایک اور روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی عورتوں کو رات کے وقت مسجد جانے کی اجازت دے دیا کرو۔ (بخاری)

حضرت عمرؓ کی اہلیہ محترمہؓ فجر اور عشا کی نمازوں میں شرکت کرنے کے لئے مسجد جایا کرتی تھیں اور حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ وہ نہ جائیں مگر صاف الفاظ میں منع نہیں فرماتے تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ کیوں مسجد جاتی ہیں جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ اسے پسند نہیں کرتے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ پھر وہ مجھے روکتے کیوں نہیں۔ لوگوں نے جواب دیا کہ وہ اس لئے نہیں روکتے کہ حضورؐ نے فرمایا ہوا ہے کہ خدا کی کنیزوں (یعنی عورتوں) کو خدا کی مساجد میں جانے سے مت روکو۔

۴- مجالس خیر میں شرکت

حفصہؓ بنت سیرین بیان کرتی ہیں کہ ہم اپنی لڑکیوں کو عید کے دن باہر نکلنے سے منع کیا کرتے تھے۔ ایک عورت آئی جو قصرِ بنی خلف میں اُتری۔ میں اس کے پاس گئی تو اس نے مجھے

بتایا کہ میری بہن کا خاوند رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بارہ غزوات میں شریک ہوا تھا اور میری بہن چھ غزوات میں اس کے ساتھ تھی۔ اس نے بتایا کہ ہم لوگ مریضوں کی دیکھ بھال کرتے تھے اور زخمیوں کا علاج کرتے تھے۔ اس نے (رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے) عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ اگر ہم میں سے کسی کے پاس چادر نہ ہو اور اس لئے وہ (عید کے دن) باہر نہ نکلے تو کیا اس میں اس کے لئے کوئی مضائقہ ہے۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ اس کی ہمجولی اسے اپنی چادر کا ایک حصّہ اوڑھالے اور عورتوں کو چاہیئے کہ وہ نیک کام میں شریک ہوں اور مومنین کی دعا میں حاضر ہوں ..... (بخاری)

حضرت اُمّ عطیہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ ہم عید کے دن گھر سے باہر نکلیں (اور نماز عید اور اجتماعی دعا میں شریک ہوں) ایک اور روایت میں آپؓ فرماتی ہیں کہ ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ ہم جوان پردے والی عورتوں کو (عید کے دن) گھر سے باہر نکالیں (تاکہ وہ نماز اور دعا میں شرکت کریں)۔ (بخاری)

۵۔ جہاد میں شرکت

قومی کاموں میں سب سے بڑا کام خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لئے جہاد کرنا اور اسلامی ریاست کی حفاظت کرنا ہے۔ صحابیاتؓ کے حالاتِ زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مردوں کے ساتھ جہاد میں بھی حصّہ لیتی رہی ہیں۔ صحیح بخاری میں کئی ایسی احادیث بیان ہوئی ہیں جن سے صحابیاتؓ کے جہاد میں شریک ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب حضورؐ سفر پر جاتے تو امہات المومنین کے درمیان قرعہ ڈالتے اور جس کے نام کا قرعہ نکلتا اسے ساتھ لے جاتے۔ ایک دفعہ جب آپؐ جہاد پر جارہے تھے تو آپؐ نے قرعہ ڈالا تو قرعہ میرے نام نکلا۔ پس میں حضورؐ کے ساتھ گئی۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ جنگِ اُحد میں میں نے حضرت عائشہؓ اور حضرت اُمّ سلیمؓ کو دیکھا کہ دونوں اپنے دامن اُٹھائے ہوئے تھیں۔ پانی کی مشکیں اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے لاتی تھیں اور پیاسے لوگوں کے منہ میں ڈال دیتی تھیں۔ پھر لوٹ جاتی تھیں اور اُنہیں بھرتی تھیں اور پھر لاکر پیاسے لوگوں کے منہ میں ڈالتی تھیں۔

حضرت عمرؓ نے مدینہ منوّرہ کی خواتین کو کچھ چادریں تقسیم فرمائیں تو ایک نہایت عمدہ چادر بچ گئی۔ پاس بیٹھنے والوں میں سے کسی نے مشورہ دیا کہ یہ چادر آپؓ اپنی اہلیہ محترمہ کو دے دیں۔ حضرت عمرؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت علیؓ کی صاحبزادی اور حضورؐ کی نواسی تھیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ حضرت ام سلیطؓ (صحابیہ) اس کی زیادہ مستحق ہیں۔ وہ اُحد کے دن ہمارے لیے مشکیں بھر بھر کر لاتی تھیں۔

حضرت رُبَیّع بنت مُعوّذ صحابیہ فرماتی ہیں کہ ہم جہاد میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جاتے تھے اور پانی پلاتے تھے اور زخمیوں کا علاج کرتے تھے اور مقتول لوگوں کو اٹھا کر مدینے لاتے تھے۔

حضرت ام حرامؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دن حضورؐ نے ان کے گھر میں قیلولہ فرمایا۔ پھر آپؐ ہنستے ہوئے بیدار ہو گئے۔ حضرت امّ حرامؓ نے عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ! آپؐ کس بات پر ہنسے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں (خواب میں) اپنی امت کے ایک گروہ کو دیکھ کر خوش ہوا جو سمندر پر اس طرح سوار ہوں گے جیسے بادشاہ تختوں پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ (حضرت ام حرامؓ فرماتی ہیں کہ) میں نے عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ دعا کیجیے کہ خدا مجھے اُن میں سے کرے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم انہیں میں سے ہو۔ پھر آپؐ سو گئے اور پھر ہنستے ہوئے بیدار ہو گئے اور اسی طرح دو مرتبہ یا تین مرتبہ فرمایا۔ میں نے (پھر) عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ! دعا کیجیے کہ اللہ مجھے اُن میں سے کرے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ تم پہلے لوگوں میں سے ہو۔ پھر حضرت عبادہؓ بن صامت نے حضرت ام حرامؓ سے شادی کرلی اور انہیں ساتھ لے کر جہاد میں گئے۔ پھر جب ام حرامؓ واپس لوٹیں تو سواری کو اُن کے قریب لایا گیا تاکہ وہ اس پر سوار ہوں تو وہ گر پڑیں اور اُن کی گردن ٹوٹ گئی۔

(بخاری)

۶۔ عورتوں کو تعلیم دینا

حضرت ابو سعیدؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ! مرد تو آپؐ کی باتیں سُن کر چلے جاتے ہیں، پس آپؐ اپنی طرف سے ہمارے لئے کوئی دن مقرر فرما دیجئے جس میں ہم آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوں

تاکہ آپؐ ہمیں وہ علم سکھائیں جو اللہ نے آپؐ کو سکھایا ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ (اچھا) تم فلاں فلاں دن فلاں فلاں جگہ پر جمع ہو جانا، چنانچہ وہ عورتیں جمع ہو گئیں اور حضورؐ ان کے پاس تشریف لائے اور جو علم آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے سکھایا تھا اُس میں سے اُنھیں تعلیم دی۔..... (بخاری)

حضرت جابرؓ بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے۔ پہلے نماز پڑھی، پھر لوگوں کو خطبہ دیا۔ پھر جب فارغ ہوئے تو اُترے اور عورتوں کے پاس آئے اور انہیں نصیحت کی اس حال میں کہ آپؐ حضرت بلالؓ کے ہاتھ پر تکیہ کیے ہوئے تھے اور حضرت بلالؓ نے اپنا کپڑا پھیلا رکھا تھا اور عورتیں اس میں صدقات ڈال رہی تھیں (راوی کہتے ہیں کہ) میں نے عطاء سے پوچھا کہ کیا اب آپ امام پر یہ بات واجب سمجھتے ہیں کہ وہ نماز سے فارغ ہو کر عورتوں کے پاس آئے اور انہیں نصیحت کرے۔ انھوں نے فرمایا کہ بے شک یہ ائمہ پر واجب ہے اور انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسا نہیں کرتے۔ (بخاری)

حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک رات رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم گھبرائے ہوئے بیدار ہوئے اور آپؐ فرما رہے تھے۔ سبحان اللہ! اللہ نے کیسے کیسے خزانے نازل کئے ہیں اور کیسے کیسے فتنوں کا نزول ہوا ہے! کون ہے جو ان حجرے والیوں کو جگا دے تاکہ نماز پڑھیں، بہت سی عورتیں ایسی ہیں جو دنیا میں لباس پہنتی ہیں مگر آخرت میں عریاں ہوں گی (راویہ کا کہنا ہے کہ) حجرے والیوں سے آپؐ کی مراد اپنی ازواج مطہرات تھیں۔ (بخاری)

۷۔ عورت کا کمانا

موجودہ زمانے میں عورت کے حقوق میں سے ایک بہت بڑا حق یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسے کمانے کی آزادی حاصل ہو۔ ہمیں قرآن و حدیث میں کوئی ایسی نص نہیں ملتی جس سے معلوم ہو کہ اگر کوئی عورت خاوند کی اجازت سے کمائے تو یہ کوئی ناپسندیدہ بات ہے۔ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ تاجر تھیں اور ام المومنین حضرت زینبؓ کے حالات میں ملتا ہے کہ آپؓ چمڑہ رنگنے کا کام کرتی تھیں اور اس سے جو آمدنی ہوتی تھی اُسے راہِ خدا میں صرف کرتی تھیں۔ لہٰذا اگر سرپرست کی اجازت سے کمائے تو اسے ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس شئے کو اگر وبار کی شکل میں پھیلا دیا گیا تو انجام کار عورت ہی کو

نقصان پہنچے گا۔ خدا نے اس کی کفالت دوسروں کے کندھوں پر ڈالی ہے اور اُسے حق دیا ہے کہ وہ اُن سے اپنے جائز اخراجات پورے کروائے۔ اب اپنی کفالت کو اپنے ہی کندھوں پر لادنے پر بے جا اصرار حقوق طلب کرنا نہیں بلکہ فرائض طلب کرنا ہے۔

اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں اُن پر بغور نگاہ ڈالنے کے بعد تعجب ہوتا ہے کہ مسلمان عورت کی مظلومی کی داستان کس بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔ لیکن جب موجودہ مسلم معاشرے پر نظر ڈالی جائے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ داستانیں کچھ بے بنیاد نہیں۔ کیونکہ اسلام نے تو عورتوں کو حقوق عطا کئے تھے مگر مسلمان کہلانے والے مردوں نے انہیں غصب کرلیا۔ چونکہ لوگ دوسرے مذاہب کی مقدس کتب کو کھول کھول کر نہیں پڑھتے بلکہ ان مذاہب کو، ماننے والوں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر اندازے لگاتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے بجا طور پر یہی سمجھا کہ مسلمان عورت مظلوم ہے۔ اب ہمارے لئے کرنے کا کام یہی ہے کہ معاشرے میں وہ اسلامی انقلاب لانے کی کوشش کریں جو دوسری بھلائیوں کے علاوہ مسلمان عورت کو اس کا صحیح مقام بھی دلوائے اور اسے معزز کرے۔

اسلامی برادری کے حقوق

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا جب تک اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے۔ (بخاری)

اس مختصر سے فرمان میں حضورؐ نے اسلامی اخوت کا نچوڑ بیان فرمادیا ہے۔ وہ کونسا انسان ہے جو اپنے لئے ہر طرح کی خیر و برکت کا طالب نہ ہو، جسے اس بات کی خواہش نہ ہو کہ اسے امن، عافیت، عزت، خوش حالی نیک نامی، جسم کا آرام اور دل کا سکون حاصل رہے، جو اس بات کا متمنی نہ ہو کہ وہ ہر قسم کی دنیوی اور اخروی تکالیف سے محفوظ رہے اور موت سے پہلے اور موت کے بعد ہر ہر مرحلے میں اسے فوز و فلاح ہی نصیب ہو ـــــ بس جو انسان اپنے مسلمان بہن بھائیوں کے لئے یہی تمنائیں رکھتا ہو جو وہ اپنے لئے رکھتا ہے، وہی مومن ہے! ـــــ کسی شخص کا صرف مسلمان ہونا اس بات کے لئے کافی ہے کہ آپ کو اس سے قلبی محبت ہو، آپ دل سے اس کی عزت کریں، ہمیشہ اس کی خیر خواہی کا دم بھریں، آپ کی زبان اور ہاتھ سے اسے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچے، وہ ہر دکھ اور تکلیف کے وقت آپ کی امداد پر بھروسہ کر سکے، اگر اس کے اور کسی دوسرے مسلمان کے درمیان کوئی رنجش یا دشمنی پیدا ہو جائے تو آپ امکان بھر کوشش کریں کہ ان کے باہمی تعلقات درست ہو جائیں اور اگر وہ کسی گناہ کی راہ پر چل پڑے تو آپ اسے راہِ راست پر لانے کے لئے ہر ممکن سعی کر گزریں!۔

۱۔ محبت، خیر خواہی اور احترام

حضرت معاذؓ بن جبل بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ میری بزرگی اور عظمت کے خیال سے (یعنی میری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے) آپس میں محبت کرتے ہیں، ان کے لئے نور کے منبر ہوں گے (اور ان پر نبی اور شہید (بھی) رشک کریں گے۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہؓ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص کسی دوسری بستی میں اپنے کسی بھائی سے ملنے گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے راستے میں ایک فرشتے کو اس کے انتظار کے لئے بھیج دیا۔ جب وہ اس کے پاس آیا تو اس نے کہا کہ تم کہاں کا ارادہ رکھتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ میں اس بستی میں اپنے ایک بھائی سے ملنے کے ارادے سے آیا ہوں۔ فرشتے نے کہا کہ کیا تیرا اس پر کوئی احسان ہے جس کی تکمیل مقصود ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں اُسے اللہ تعالیٰ کی خاطر چاہتا ہوں۔ فرشتے نے کہا کہ میں تیری طرف خدا کا پیغامبر ہوں (اور تجھے یہ بتانے آیا ہوں) کہ جس طرح تو اُس سے خدا کی خاطر محبت رکھتا ہے، اسی طرح خدا بھی تجھ سے محبت رکھتا ہے۔ (مسلم)

ایک دن حضرت جریرؓ بن عبداللہ نے منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں کو مخاطب کیا اور کچھ نصیحتیں کیں۔ آخر میں آپؓ نے فرمایا:

"میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں اسلام پر آپؐ سے بیعت کرتا ہوں۔ آپؐ نے مجھ سے مسلمان رہنے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے کی شرط کرائی۔ پھر میں نے اس پر آپؐ سے بیعت کی اور اس مسجد کے ربّ کی قسم کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔" پھر انھوں نے استغفار کی اور منبر سے نیچے اُتر آئے۔ (بخاری)

حضرت صفوان بیان کرتے ہیں کہ میں شام گیا تو حضرت ابوالدرداءؓ کے پاس اُن کے مکان پر پہنچا۔ میں نے انہیں (گھر پر) نہ پایا مگر حضرت امّ الدرداءؓ مل گئیں۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا اس سال حج کا ارادہ ہے۔ میں نے کہا کہ جی ہاں! فرمانے لگیں کہ پھر اللہ سے ہمارے لئے

دعائے خیر کرنا۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ کسی مسلمان شخص کی وہ دعا جو اس نے اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے اس کی غیر حاضری میں کی ہو، (اللہ تعالیٰ کے ہاں) قبول ہوتی ہے۔ دعا کرنے والے کے سر کے پاس ایک موکل فرشتہ ہوتا ہے۔ جب بھی وہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے دعائے خیر کرتا ہے تو اس کا موکل فرشتہ کہتا ہے "آمین! اور تجھے بھی اسی کی مانند ملے۔" (مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ایماندار شخص کسی مسلمان کے جنازے کے ہمراہ ثواب سمجھ کر چلتا ہے اور جب تک کہ اس پر نماز پڑھ لی جائے اور دفن سے فراغت حاصل کر لی جائے، اس کے ہمراہ رہتا ہے تو وہ دو قیراط ثواب لے کر لوٹتا ہے (ان میں کا) ہر قیراط اُحد (پہاڑ) کے برابر ہوتا ہے اور جو شخص جنازے پر نماز پڑھ لے پھر قبل اس کے کہ اُسے دفن کیا جائے، لوٹ آئے تو وہ ایک قیراط ثواب لے کر لوٹتا ہے۔ (بخاری)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا کہ کہاں ہیں وہ لوگ جو میری بزرگی اور عظمت کے خیال سے آپس میں محبت کرتے تھے۔ آج جب میرے سائے کے سوا اور کوئی سایہ نہیں میں انہیں اپنے سائے میں جگہ دوں گا۔ (مؤطا)

ابوادریس خولانی بیان کرتے ہیں کہ میں دمشق کی جامع مسجد میں داخل ہو تو میری نگاہ ایک شخص پر پڑی، جس کے دانت، خوبصورت، چمکدار تھے۔ لوگ اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جب اُن میں کسی چیز کے بارے میں اختلاف ہوتا تو اس کی طرف رجوع کرتے اور اس کی رائے پر عمل کرتے۔ میں نے اس کے متعلق دریافت کیا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ حضرت معاذؓ بن جبل (صحابی) ہیں۔ جب اگلا دن ہوا تو میں سویرے ہی (مسجد میں) جا پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے بھی پہلے آچکے تھے اور نماز پڑھ رہے تھے۔ میں انتظار میں بیٹھ گیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی نماز ختم کر لی۔ پھر میں ان کے سامنے سے اُن کے پاس آیا اور انہیں سلام کیا اور کہا:

خدا کی قسم میں آپ سے محبت رکھتا ہوں۔

انھوں نے فرمایا۔ "کیا خدا کے لئے؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں، خدا کے لئے۔"

انھوں نے (پھر) فرمایا کہ "کیا خدا کے لئے؟"

میں نے (پھر) جواب دیا کہ "ہاں خدا کے لئے"

انھوں نے میری چادر کا کنارہ پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا پھر فرمایا۔

"خوشخبری حاصل کرو، بے شک میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ میرے لئے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور میرے لئے ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں اور میرے لئے ایک دوسرے کی ملاقات کو جاتے ہیں اور میرے لئے ایک دوسرے پر مال خرچ کرتے ہیں، ان سے محبت کرنا میرے لیے واجب ہے۔" (مؤطا)

حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ نیکی میں سے کسی شئے کو حقیر نہ سمجھنا چاہے وہ اتنی ہی ہو کہ تو اپنے (مسلمان) بھائی سے کشادہ پیشانی سے ملے۔ (مسلم)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت کو نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (ترمذی)

۲۔ ہمدردی اور امداد باہمی

حضرت ابو موسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (ایک) مومن (دوسرے) مومن کے لئے ایک عمارت کی مانند ہے کہ اس کا ایک حصّہ دوسرے حصّے کو مضبوطی بخشتا ہے۔ (مسلم)

حضرت نعمان بن بشیرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن ایک دوسرے سے محبت کرنے میں اور ایک دوسرے پر رحم کرنے میں اور ایک دوسرے

پر مہربانی کرنے میں ایک بدن کی مانند ہیں کہ جب اس کا کوئی ایک عضو کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو باقی سارا جسم جاگتے رہنے میں اور بخار زدہ ہو جانے میں اس کا شریک ہوتا ہے (یعنی جب جسم کے کسی ایک عضو کو کوئی دکھ درد پہنچتا ہے تو سارا جسم جاگتا رہتا ہے اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے)۔ (مسلم)

حضرت ابوالدرداءؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کی عزت کو تنگی سے روکا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے منہ سے آگ کو روکے گا۔ (ترمذی)

حضرت جابرؓ بن عبداللہ اور حضرت ابوطلحہؓ بن سہل انصاریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان کو ذلیل کرے گا، کسی ایسے مقام پر کہ اس (مسلمان) کی آبرو جاتی رہے اور اس کی عزت گھٹ جائے تو اللہ اُسے ذلیل کرے گا، ایسے مقام میں جہاں وہ اس کی مدد پسند کرے گا اور جو شخص مدد کرے کسی مسلمان کی کسی ایسے مقام میں جہاں اس کی عزت گھٹتی ہو اور اس کی حُرمت جاتی ہو تو اللہ مدد کرے گا اس کی ایسی مقام میں جہاں اُسے اس کی مدد پسند ہو گی۔

(ابوداؤد)

حضرت ابوبرزہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے (حضورؐ کی خدمت میں) عرض کیا کہ اے خدا کے نبیؐ! مجھے کوئی ایسی شئے سکھایئے جس سے میں فائدہ حاصل کروں۔ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے راستے سے ایذا دینے والی چیز کو ایک طرف کر دیا کرو۔ (مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک درخت مسلمانوں کو تکلیف دیا کرتا تھا۔ ایک شخص آیا اور اُس نے اسے کاٹ دیا (جس سے مسلمان تکلیف سے بچ گئے) تو وہ شخص جنت میں داخل ہو گیا۔ (مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اُسے دشمن کے حوالے کرتا ہے۔ اور جو کوئی اپنے (مسلمان) بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا ہو گا اللہ تعالیٰ اُس کی

حاجت پوری کرنے میں لگا ہوگا اور جس نے کسی مسلمان کا کوئی دُکھ دُور کیا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کے دُکھوں میں سے اُس کا کوئی دُکھ دُور کرے گا اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کے مسلمان پر چھ حقوق ہیں۔ پوچھا گیا کہ یا رسولؐ اللہ! وہ کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ:

۱۔ جب تو اُسے ملے تو اُسے سلام کر،

۲۔ اور جب وہ تیری دعوت کرے تو قبول کر،

۳۔ اور جب وہ تجھ سے نصیحت چاہے تو اسے نصیحت کر (یا جب وہ تجھ سے خیر خواہی کا طالب ہو تو اس کی خیر خواہی کر)

۴۔ اور جب وہ چھینکے اور الحمد للہ کہے تو اُسے یرحمک اللہ کہہ (جس کا مطلب ہے کہ خدا تم پر رحم فرمائے)

۵۔ اور جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کر،

۶۔ اور جب وہ مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جا۔ (مسلم)

حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس ایک سائل آیا اور آپؓ سے سوال کیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس سے فرمایا کہ کیا تو گواہی دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے عرض کیا کہ جی ہاں! آپؓ نے فرمایا کہ کیا تو گواہی دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسولؐ ہیں۔ اس نے عرض کیا کہ جی ہاں! حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ کیا تو رمضان کے روزے رکھتا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ جی ہاں! (اس پر) حضرت ابن عباسؓ بولے کہ تو نے سوال کیا ہے اور سائل کا بھی حق ہوتا ہے۔ اب ہم پر ضروری ہے کہ ہم تیرے ساتھ حسنِ سلوک کریں۔ پھر اُسے ایک کپڑا عنایت کیا اور پھر فرمایا کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ جس مسلمان نے کسی مسلمان کو کوئی کپڑا پہنایا تو جب تک اُس کپڑے کی کوئی دھجّی پہننے والے کے جسم پر رہے گی پہنانے والا خدا کی حفاظت میں رہے گا۔

(ترمذی)

۳۔ باہمی صلح و اتفاق

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پیر اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور ہر اُس بندے کو بخش دیا جاتا ہے جس نے خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو سوائے اس شخص کے کہ اس کے اور اس کے (مسلمان) بھائی کے درمیان عداوت ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کو مہلت دو یہاں تک کہ آپس میں صلح کر لیں۔ (مسلم)

حضرت ابوایوبؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے (مسلمان) بھائی کو تین راتوں سے زیادہ چھوڑے رکھے کہ دونوں ملتے ہیں تو ایک اس طرف منہ کر لیتا ہے اور دوسرا اُس طرف منہ کر لیتا ہے اور ان دونوں میں سے بہتر وہ ہے جو پہلے سلام کرے (اور اس طرح صلح کرنے کا آغاز کرے۔)

(بخاری، مسلم)

سورۃ الحجرات، آیت دس۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ — "مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لہذا

فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ۔ — اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو۔"

اس فرمان کی رو سے ایک مسلمان کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ صلح و اتفاق سے رہے بلکہ اگر دوسرے مسلمانوں کے تعلقات آپس میں خراب ہوگئے ہوں تو اُن کی باہم صلح کرانے کا بھی اہتمام کرنا چاہیئے جیسے کہ حضورؐ کی سنّت ہے۔

حضرت سہل بن سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ (قبیلہ) بنی عمرو بن عوف کے کچھ لوگوں کے درمیان کچھ جھگڑا تھا تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کچھ صحابہؓ کے ساتھ ان کے درمیان صلح کرانے تشریف لے گئے ..... (بخاری)

ایسے ہی بخاری میں حضرت عائشہؓ اور آپؓ کے بھانجے حضرت ابن زبیرؓ کے بارے میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضرت عائشہؓ کسی بات پر اُن سے ناراض ہوگئیں اور نذر

مان لی کہ اب کبھی ان سے بات نہیں کروں گی۔ جب اُن کی ناراضی کو زیادہ دیر ہوگئی تو حضرت ابن زبیرؓ نے سفارش کرائی مگر انھوں نے فرمایا کہ خدا کی قسم! نہ میں سفارش قبول کروں گی اور نہ اپنی نذر توڑوں گی۔ حضرت ابن زبیرؓ سخت پریشان تھے۔ انھوں نے حضرت مسوؔر بن مخرمہ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن اسود سے بات کی اور کہا کہ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھے حضرت عائشہؓ کے پاس لے چلیں اور کہا کہ ان کے لئے جائز نہیں تھا کہ میرے ساتھ قطع تعلق کرنے کی نذر مان لیتیں۔ حضرت مسوؔر اور حضرت عبدالرحمٰن نے اپنی چادریں اوڑھیں اور حضرت ابن زبیرؓ کو لے کر حضرت عائشہؓ کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے اندر آنے کی اجازت مانگی اور یوں کہا کہ السلام علیكِ ورحمة الله وبركاته، کیا ہم اندر آجائیں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آجاؤ۔ انھوں نے کہا کہ کیا ہم سب کے سب آجائیں۔ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ ہاں سب کے سب آجاؤ اور وہ نہیں جانتی تھیں کہ اُن کے ساتھ حضرت ابنِ زبیرؓ بھی ہیں۔ پس جب وہ سب داخل ہوئے تو حضرت ابنِ زبیرؓ پردے کے اندر گھُس کر خالہ کے گلے لگ گئے اور انھیں خدا کا واسطہ دینے اور رونے لگے اور حضرت مسوؔرؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بھی حضرت عائشہؓ کو قسمیں دینے لگے کہ ابنِ زبیرؓ سے بات کیجئے اور اُن کے عُذر کو قبول کیجئے اور کہا کہ آپ جانتی ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ترکِ تعلق سے منع فرمایا ہے اور تلقین فرمائی ہے کہ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی کو تین راتوں سے زیادہ کے لئے چھوڑے رکھے۔ جب دونوں صاحبوں نے زیادہ زور ڈالا تو حضرت عائشہؓ رونے لگیں کہ میں نے تو نذر مانی ہوئی ہے کہ ابنِ زبیرؓ سے کبھی نہیں بولوں گی اور نذر کا معاملہ بہت سخت ہوتا ہے۔ مگر وہ دونوں نہ مانے، یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت زبیرؓ سے بات کرلی اور آپس آپس میں صلح ہوگئی اور حضرت عائشہؓ نے اپنی نذر کے کفارے میں چالیس غلام آزاد کیے۔

۴۔ ایک دوسرے کی اصلاح کرنا

مسلمانوں کی باہمی خیرخواہی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اگر اپنا کوئی بھائی غلط راہ پر چل پڑا ہو تو اسے سیدھی راہ کی طرف لانے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ جس سے انسان کو

واقعی محبت ہوتی ہے اس کے بارے میں اسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ وہ دنیوی یا اخروی کسی طرح کے بھی عذاب کا مستحق ہو جائے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ہر کوئی اپنے بھائی کا آئینہ ہے۔ پس اگر وہ اس میں کوئی بُرائی دیکھے تو اُسے اُس سے دُور کر دے۔ (ترمذی)

مراد یہ ہے کہ کوشش کرے کہ بھائی کی وہ بُرائی دُور ہو جائے اور وہ صالح اور نیک بن کر رہے۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بھائی کی امداد کر چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! جب وہ مظلوم ہو تو میں اس کی مدد کرتا ہوں، مگر جب وہ ظالم ہو تو فرمائیے کہ میں کس طرح اس کی مدد کروں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تو اسے ظلم کرنے سے روک دے کہ یہی اس کی امداد ہے۔ (بخاری)

۵۔ تکفیر کی ممانعت

ایک خاص بات جس کی حضورؐ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو کافر نہ کہیں۔ یہ سخت افسوس اور دُکھ کا مقام ہے کہ چھوٹے چھوٹے مسائل میں باہمی اختلاف ہونے کے باعث لوگ بے تکلف ایک دوسرے پر کفر اور منافقت کا الزام لگانا شروع کر دیتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنے (مسلمان) بھائی کو "اے کافر" کہہ کر پکارا تو دونوں میں سے ایک (ضرور) اس کا مستحق ہو گیا۔ (بخاری)

مراد یہ ہے کہ اگر وہ شخص جسے کافر کہا گیا ہے، کافر نہ ہو گا تو پھر کہنے والا کفر کا مستحق ہو جائے گا۔

ایسے ہی بخاری ہی کی ایک اور روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مومن پر لعنت کرنا اسے قتل کرنے کی مانند ہے اور جس نے کسی مومن پر کافر ہونے کا الزام لگایا تو یہ (بھی) اسے قتل کرنے کی مانند ہے۔

بخاری ہی میں ایک اور حدیث بیان ہوئی ہے کہ ایک دن حضورؐ ایک نابینا صحابیؓ کے ہاں تشریف فرما تھے اور اُس گھر میں محلے کے بہت لوگ جمع تھے۔ اُن میں سے کسی نے کہا کہ مالک بن دخشن کہاں ہے۔ حاضرین میں سے کوئی بول اُٹھا کہ وہ تو منافق ہے، اللہ اور اُس کے رسولؐ سے محبت نہیں رکھتا۔ اس پر حضورؐ نے بات کرنے والے کو ٹوکا اور فرمایا کہ ایسے نہ کہو، کیا تم دیکھتے نہیں کہ اُس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کہا ہے اور اس سے اس کا مقصود اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے ..... (بخاری)

۶۔ باہمی ایذا رسانی سے پرہیز

حضرت ابوموسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! کونسا اسلام افضل ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ (اس شخص کا اسلام) جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہوں۔ (بخاری)

حضرت ابوبکرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ جب دو مسلمان اپنی تلواروں کے ساتھ باہم مقابلہ کریں، تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخ میں جائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! قاتل تو ہوا مگر مقتول (کے دوزخ میں جانے) کا کیا سبب؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ بھی تو اپنے (مسلمان) ساتھی کو قتل کرنے کا خواہش مند تھا۔ (بخاری)

حضرت عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔ (بخاری)

حضرت ابوموسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ہم پر ہتھیار اُٹھایا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (بخاری)

حضرت جریرؓ بیان کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ لوگوں کو چپ کرادو۔ پھر (لوگوں کو مخاطب کرکے) فرمایا کہ میرے بعد کافر نہ ہوجانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ (بخاری)

حضرت ابو اُمامہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اپنی (جھوٹی) قسم سے کسی مسلمان کا حق اُڑا لیا، اللہ اس پر جنت حرام کردے گا اور اُس کے لئے دوزخ واجب کردے گا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ چاہے وہ حق تھوڑا سا ہی ہو یا رسولؐ اللہ ـــــ آپؐ نے فرمایا کہ چاہے وہ پیلو کی ایک شاخ ہو، چاہے وہ پیلو کی ایک شاخ ہو، چاہے وہ پیلو کی ایک شاخ ہو۔ آپؐ نے اس بات کو تین دفعہ فرمایا۔ (مؤطا)

متفرق حقوق

مہمان اور میزبان کے حقوق

انسانی زندگی کو حسن و خوبی کے ساتھ گزارنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ انسان باہم ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہیں اور اس کے لئے ایک دوسرے کے گھر جانا پڑتا ہے۔ ایسے ہی بسا اوقات سفر کرنے کی ضرورت بھی پیش آتی رہتی ہے اور ہر جگہ ہوٹلوں سراؤں وغیرہ کا بندوبست نہیں ہوتا جہاں مسافر جا کر ٹھہر جائے۔ پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مسافر ہوٹلوں، سراؤں کے اخراجات ادا کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو۔ لہٰذا یہ شئے انسان کے لئے بہت زیادہ سہولت کا باعث بنتی ہے کہ وہ کچھ دیر کے لئے کسی دوسرے انسان کے گھر ٹھہر جائے جو اس کی رہائش اور کھانے پینے کا بندوبست کردے اور اس طرح مسافر کی ضروریات بھی پوری ہوجائیں اور وہ تکلیف سے بھی بچ جائے اور اس پر مالی بوجھ بھی نہ پڑے۔ اسلام نے انسانی زندگی کی ان ضروریات کو حسن و خوبی کے ساتھ پورا کرنے کے لئے مہمان اور میزبان دونوں کے حقوق قائم کردیے ہیں۔ اسلامی احکام و ہدایات کی رُو سے مہمان کا یہ حق ہے کہ:

۱۔ میزبان اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کرے
۲۔ جہاں تک استطاعت ہو اس کی خاطر داری کرے اور
۳۔ جب تک وہ اس کے گھر میں ہے اس کی عزت کی حفاظت کرے۔

دوسری طرف میزبان کا بھی یہ حق ہے کہ :

۱۔ مہمان اسے ستائے نہیں

۲۔ اس کے پاس اتنی لمبی مدت نہ ٹھہرے کہ وہ تنگ آجائے اور

۳۔ اس کی مہربانی کا شکر گزار ہوتے ہوئے اس کے لئے دعائے خیر کرے۔

حضرت ابوہریرۃؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیئے کہ اچھی بات کہے یا (پھر) خاموش رہے اور جو کوئی خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیئے کہ اپنے ہمسائے کی تعظیم کرے اور جو کوئی خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیئے کہ اپنے مہمان کی خاطر داری کرے۔ (مسلم)

حضرت ابوشریح عدویؓ بیان کرتے ہیں کہ میری دونوں آنکھوں نے رسولِ خُدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور میرے دونوں کانوں نے سُنا، جبکہ آپؐ نے فرمایا کہ جو کوئی خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیئے کہ اپنے مہمان کی (مقدور کے مطابق) اچھی طرح خاطر داری کرے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اچھی طرح کی جانے والی خاطر داری کی مدت کتنی ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ایک دن اور ایک رات (اور پھر) فرمایا کہ (مہمان کو) کھانا کھلانا تین دن کے لئے ہے اور اس کے بعد (پھر جو کچھ میزبان اپنے مہمان پر خرچ کرے) تو وہ خیرات (شمار ہوتی) ہے..... (ترمذی)

صحیح مسلم میں بھی اسی مضمون کی ایک حدیث بیان ہوئی ہے جس کے راوی حضرت ابوشریح خزاعیؓ ہیں۔ اس حدیث کے آخر میں بیان ہوا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

"..... کسی مسلمان شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کے ہاں (مہمان) ٹھہرا رہے، یہاں تک کہ اسے گنہگار کردے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! وہ اسے کیسے گنہگار کرے گا؟ حضورؐ نے فرمایا: (اس طرح) کہ وہ اس کے پاس ٹھہرا رہے یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی شے نہ رہے جس سے وہ اس کی مہمانداری کرے۔ (مسلم)

ابوالاحوص اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اے خدا کے رسول! میں کسی شخص کے پاس سے گزرتا ہوں تو وہ نہ میری میزبانی کرتا ہے (اور) نہ مجھے کھانے پینے کو دیتا ہے (پھر) وہ (کبھی) میرے پاس سے گزرتا ہے تو کیا میں اُسے اس کا بدلہ دُوں ؟ (یعنی میں بھی اس کی میزبانی نہ کروں) حضورؐ نے فرمایا کہ نہیں (بلکہ) تو اس کی میزبانی کر..... (ترمذی)

حضورؐ کی تعلیمات کے زیرِ اثر صحابۂ کرامؓ میں مہمان نوازی کا اتنا جذبہ پیدا ہو چکا تھا کہ خود تکلیف اُٹھا کر بھی مہمان کی خاطرداری کرتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں فاقے سے ہوں۔ حضورؐ نے اپنی ازواجِ مطہراتؓ میں سے کسی کی طرف آدمی بھیجا (تاکہ اس فاقہ زدہ شخص کو کچھ کھلانے کا بندوبست کیا جائے) مگر زوجۂ محترمہ نے کہلا بھیجا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میرے پاس تو پانی کے سوا کچھ نہیں پھر آپؐ نے اپنی کسی دوسری زوجۂ محترمہ کے پاس آدمی بھیجا مگر انھوں نے بھی ویسا ہی جواب بھیجا۔ یہاں تک کہ سب ازواجِ مطہراتؓ نے وہی بات کہلا بھیجی کہ اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ میرے پاس تو پانی کے سوا کچھ نہیں۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص آج رات اس کی میزبانی کرے گا اس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا۔ اس پر انصار میں سے ایک صاحب کھڑے ہو گئے اور عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! میں (کروں گا) پھر وہ اسے ساتھ لے کر اپنے گھر پہنچے اور اپنی بیوی سے کہا کہ کیا تمہارے پاس کچھ (کھانے کو) ہے۔ بیوی نے جواب دیا کہ بچوں کے کھانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ انصاریؓ نے فرمایا کہ بچوں کو کسی چیز سے بہلا دو اور جب مہمان داخل ہو تو چراغ بجھا دینا اور اُس پر یہ ظاہر کرنا کہ گویا ہم (بھی) کھا رہے ہیں، جیسے ہی وہ کھانے کے لئے جھکے تم اُٹھ کر چراغ گل کر دینا (چنانچہ ایسا ہی کیا گیا) بس وہ (سب کھانے تو) بیٹھے مگر کھایا (صرف، مہمان نے جب صبح ہوئی تو دونوں حضورؐ کی خدمت میں پہنچے تو حضورؐ نے فرمایا کہ رات تم نے اپنے مہمان سے جو سلوک کیا۔ اللہ تعالیٰ اس پر تعجب کے ساتھ خوش ہوا۔ (مسلم)

بیمار کے حقوق

بیمار چونکہ جسمانی تکالیف اور ذہنی پریشانی کا شکار رہتا ہے اس لئے اس بات کا مستحق سمجھا گیا ہے کہ اس کے دُکھ کو کم کرنے اور اس کے دل کو تسلی دینے کی کوشش کی جائے۔ حضورؐ کے سوانح حیات سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ غیر مسلموں اور منافقوں کی بھی عیادت فرماتے تھے۔ لوگوں کو بیماروں کی عیادت کرنے کا شوق دلانے کے لئے یہ واضح فرما دیا گیا ہے کہ عیادت کرنا بہت زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہوتا ہے۔

حضرت ثوبانؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو وہ برابر بہشت کی میوہ خوری میں رہتا ہے۔ (ترمذی)

حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ جب کوئی شخص — دن کے آخری حصے میں کسی مریض کی عیادت کرتا ہے تو اس کے ساتھ ستّر ہزار فرشتے نکلتے ہیں جو صبح ہونے تک اس کے لئے مغفرت مانگتے رہتے ہیں اور اس کے لئے بہشت میں ایک باغ معین کیا جاتا ہے اور جو کوئی دن کے شروع حصے میں کسی مریض کی عیادت کرتا ہے تو اس کے ساتھ (بھی) ستّر ہزار فرشتے نکلتے ہیں جو شام تک اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں اور اس کے لئے (بھی) جنت میں ایک باغ معین کیا جاتا ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص مریض کی عیادت کرتا ہے تو وہ (خدا تعالیٰ کی) رحمت میں گھس جاتا ہے... (مؤطا)

قرضدار اور قرض خواہ کے حقوق

بسا اوقات انسان کو اپنی کسی ضرورت یا تنگدستی کے باعث قرض لینے کی ضرورت پیش آجاتی ہے اور اس طرح دو انسانوں کے درمیان ایک خاص قسم کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اسلام میں قرضدار اور قرض خواہ دونوں کے حقوق قائم کر دیے گئے ہیں، جن سے غرض و غایت

یہ ہے کہ ایک طرف تو ضرورتمند انسان کی ضرورت پوری ہو جائے اور دوسری طرف جس شخص نے ضرورت کے وقت اس کی امداد کی ہے وہ بھی نقصان میں نہ رہے۔ لہٰذا ایک طرف قرض خواہ کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر قرضدار تنگ دست ہے اور وقت معینہ پر قرضہ ادا نہیں کر سکتا تو وہ اُسے مزید مہلت دے دے اور اگر وہ رضائے الٰہی کی خاطر اُسے قرضہ معاف کر دے تو یہ تو پھر بہت ہی زیادہ فضیلت کی بات ہوگی۔ دوسری طرف قرضدار کو بھی تاکید کی گئی ہے کہ جب قرضہ لے تو اس نیت سے لے کہ اس نے اسے ادا کرنا ہے اور حتی الامکان وقت مقررہ پر پوری دیانتداری سے قرض ادا کرے اور بلاوجہ ٹال مٹول کرنے سے پرہیز کرے، ورنہ خطا کار سمجھا جائے گا۔

سورۃ البقرہ آیت ۲۸۰ میں اللہ تعالیٰ نے تنگ دست قرضدار کے ساتھ نرمی کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

"اور اگر (تمہارا قرضدار) تنگدست ہو تو کھلنے تک سے مہلت دو اور جو صدقہ کردو (یعنی قرضہ معاف کردو) تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو۔"

صحیح مسلم میں حضرت ابوالیسرؓ کی ایک روایت بیان ہوئی ہے جس میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں کہ میری ان دونوں آنکھوں نے دیکھا اور میرے ان دونوں کانوں نے سُنا اور میرے اس دل نے یاد رکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی تنگدست (قرضدار) کو مہلت دی یا اُس کو قرضہ معاف کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اُسے اپنے سائے میں جگہ دے گا۔ (مسلم)

مسلم ہی میں اسی مضمون کی ایک اور حدیث ہے جس کے راوی حضرت حذیفہؓ ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے پہلے والے لوگوں میں سے ایک شخص کی روح کو فرشتے لے کر چلے تو اس سے دریافت کیا کہ کیا تُو نے کوئی نیکی کا کام کیا ہے۔ وہ بولا کہ نہیں۔ فرشتوں نے کہا کہ یاد تو کرو۔ وہ بولا کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور اپنے ملازموں کو اس بات کا حکم دیا کرتا تھا کہ تنگدست کو مہلت دو اور مالدار پر آسانی کرو (اس پر) اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں سے) فرمایا کہ تم بھی اس پر آسانی کرو۔

یہ تو وہ احادیث ہیں جن میں قرضدار کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے کی ہدایت ہے، دوسری

طرف قرضدار کو بھی تلقین فرمائی گئی ہے کہ وہ اپنے قرض خواہ کے حقوق ادا کرنے میں تساہل سے کام نہ لے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مالدار (قرضدار) کا (قرضے کی ادائیگی میں) ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی ایک اور روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے لوگوں کا مال (قرض) لیا اور اس کا ارادہ ادا کرنے کا تھا تو اللہ تعالیٰ اُسے ادا کروا دے گا اور جس نے اس ارادے سے لیا کہ اُسے ضائع کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس (قرضدار) کو تباہ کر دے گا۔ (بخاری)

ایک دن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے اور اُن کے سامنے بیان فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا افضل ترین اعمال ہیں۔ اس پر ایک شخص کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپؐ کا کیا خیال ہے کہ اگر میں خدا کی راہ میں قتل ہو جاؤں تو کیا یہ میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں، بشرطیکہ تم اس حالت میں اللہ کی راہ میں قتل ہو کہ تم صبر کرنے والے ہو، نیک نیّت ہو، آگے بڑھنے والے ہو اور پیٹھ دکھانے والے نہ ہو۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ (اچھا پھر کہو) تم نے کیا کہا تھا۔ اُس شخص نے (پھر) عرض کیا کہ آپؐ کا کیا خیال ہے کہ اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا یہ میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ آپؐ نے (پھر) فرمایا کہ ہاں، بشرطیکہ تم صبر کرنے والے ہو، نیک نیّت ہو، آگے بڑھنے والے ہو، پُشت دکھانے والے نہ ہو (اگر تم اس طرح راہِ خدا میں جان دو گے تو تمہارے سب گناہ معاف ہو جائیں گے) سوائے قرضے کے (کہ وہ اس صورت میں بھی معاف نہ ہو گا) یہ جبرئیلؑ نے مجھ سے کہا ہے۔ (ترمذی)

ظاہر ہے کہ یہ وعید اُنہیں لوگوں کے لئے ہے جو قرض ادا کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے یا جو ادائیگی کی استطاعت رکھنے کے باوجود ادا کرنے میں سستی برتتے ہیں یا از روئے بد دیانتی ادا کرنا ہی نہیں چاہتے۔ باقی رہے وہ لوگ جو اتنے تنگدست ہیں کہ ادا کرنے کی نیّت رکھنے کے باوجود ادائیگی کی سکت نہیں رکھتے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معذور سمجھے جائیں گے۔

مزدور کے حقوق

حضرت عبداللہؓ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبل اس کے کہ مزدور کا پسینہ خشک ہو، اُسے اس کی مزدوری دے دو۔ (ابن ماجہ)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن میں تین آدمیوں کا دشمن ہوں گا اور جس کا میں دشمن ہوں گا اس پر میں قیامت کے دن غالب آؤں گا۔ (ایک) وہ شخص جس نے میرا نام لے کر عہد او را قرار کیا پھر اُس کو توڑ ڈالا۔ (دوسرے) وہ شخص جس نے کسی آزاد شخص کو (غلام بنا کر) بیچ ڈالا اور اُس کی قیمت کھائی اور (تیسرے) وہ شخص جس نے کسی مزدور کو کام پر لگایا، پھر اُس سے کام تو پورا لیا مگر اس کو اس کی مزدوری نہ دی۔ (ابن ماجہ)

ان احادیثِ پاک کی روشنی میں مزدور کے جو حقوق معین ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اُسے اس کی محنت کا اجر پورا پورا دیا جائے اور جلد ادا کیا جائے۔

ذِمّی کے حقوق

اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلم "ذمّی" یا اہل الذمّہ "کہلاتے ہیں کیونکہ اسلامی حکومت نے ان کی جان، مال اور عزّت کی حفاظت کا ذمہ لیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ نام ہی واضح کر رہا ہے کہ اسلام نے ذمّیوں کو اس بات کا حق عطا کیا ہوا ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ امن و امان کی زندگی گزاریں اور اُن پر کسی قسم کا ظلم و زیادتی نہ ہونے پائے۔ انہیں اس بات کا بھی پورا حق حاصل ہے کہ وہ جس مذہب کو سچّا سمجھتے ہیں، اس پر قائم رہیں۔ مسلمان دینِ اسلام کو ان کے سامنے پیش تو کریں گے مگر انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کریں گے۔ سورۃ البقرہ، آیت ۲۵۶ میں ارشاد ہوا ہے:

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ ۙ قف لا "دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔"

ایسے ہی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ذمّی پر ظلم کرنے والے کو سخت وعید سُنائی ہے حضورؐ کا فرمان ہے کہ :

"جس نے کسی ذمّی کو قتل کیا وہ جنّت کی خوشبو بھی نہ پائے گا حالانکہ جنّت کی خوشبو ستّر برس کی مسافت سے آ رہی ہو گی۔" (نسائی)

نیز آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ :

"آگاہ رہو کہ جس شخص نے کسی ذمّی پر ظلم کیا یا اس کے حق میں کوئی کمی کی یا اُس کی طاقت سے بڑھ کر اُسے تکلیف دی یا اس کی خوشی کے بغیر اس سے کوئی چیز لے لی تو میں قیامت کے دن (اس ذمّی کا حامی بن کر اُس ظلم و زیادتی کرنے والے کے ساتھ بحث کروں گا اور اُس) بحث میں اس پر غالب آؤں گا۔" (ابوداؤد)

ایسے ہی حضرت عمرؓ نے بھی ذمّیوں کے بارے میں تاکید فرمائی ہے، بخاری میں آپؓ کا ایک فرمان روایت کیا گیا ہے کہ :

"(جو کوئی میرے بعد خلیفہ بنے) میں اُسے ان لوگوں کے بارے میں وصیت کرتا ہوں جن کا ذمّہ خدا اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا ہوا ہے کہ اُن کے ساتھ کیے جانے والے قول و قرار کو پورا کیا جائے اور ان کی جانب سے لڑا جائے اور انہیں اس بات کی تکلیف نہ دی جائے جو ان کی طاقت سے باہر ہو۔" (بخاری)

مختصر یہ کہ اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا کو اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہیں، اُن کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ ہونے پائے اور ان کی جان، مال اور عزّت بالکل محفوظ ہو۔

انسانی برادری کے حقوق

آخر میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اسلامی احکام کی رُو سے کسی انسان کا صرف انسان ہونا ہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ اس سے ہمدردی کی جائے، اس کے ساتھ حسنِ سلوک روا رکھا جائے اور بلاوجہ اس کی جان، مال اور آبرو کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا

جائے۔ بنی نوعِ انسان سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور اس لحاظ سے ایک دوسرے کے بہن بھائی ہیں۔ لہٰذا انہیں ایک دوسرے کا خیر خواہ ہونا چاہیئے۔ اس خیر خواہی کی نمایاں شکلیں یہ ہیں:

۱۔ اپنے انسانی بھائیوں کو بُرائی سے روکا اور راہِ راست کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ دنیا میں بھی سکونِ قلب حاصل کریں اور آخرت میں بھی دائمی کامیابی سے ہمکنار ہوں۔

۲۔ ان کی جان، مال اور عزّت کا پورا پورا احترام کیا جائے اور انہیں حلال نہ کیا جائے سوائے اس صورت کے کہ حق کی رُو سے ویسا کرنا ضروری ہو۔

۳۔ حتی الامکان ان سے حسنِ سلوک روا رکھا جائے اور ان کے دُکھ تکلیف میں ہمدردی کا رویّہ اختیار کیا جائے اور امداد کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہؓ (بن مسعود) بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مخلوق اللہ کی عیال ہے۔ پس اسے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی عیال سے حسنِ سلوک کرے۔ (شعب الایمان للبیہقی)
